برطانوی راج

(ایک تجزیہ)

ڈاکٹر مبارک علی

انتساب

طاہرہ مظہر علی خان

کے نام

پیش لفظ

ماضی کو جب بھی حال کی روشنی میں دیکھا جائے' یا اس کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے بارے میں مختلف نقطہائے نظر پیدا ہوتے اور بدلتے رہتے ہیں۔ آج جب ہم حال کے تناظر میں برطانوی عہد کو دیکھتے ہیں تو ہمارا نقطہ نظر اس وقت سے بالکل مختلف ہے کہ جو اس دور میں رہنے والوں کا تھا۔ ان میں سے بھی اکثر آج جب اس عہد کو موجودہ حالات میں دیکھتے ہیں تو ان کی رائے بھی بدل جاتی ہے۔ جیسے جیسے حال میں تبدیلی آتی ہے ایسے ایسے ماضی کی جانب ہمارا رویہ بھی بدلتا جاتا ہے۔

آج کے حالات میں جب ہم موجودہ دور کی بدعنوانیوں' اور سیاسی افراتفری کا شکار ہیں' تو ہم برطانوی عہد کی سامراجیت' نسل پرستی' اقتصادی لوٹ کھسوٹ' اور اہل ہندوستان کی ذلت کو بھول جاتے ہیں اور اس کے برعکس اس دور کی اچھی یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔

اس مختصر سے مقالہ میں تجزیہ کیا گیا ہے کہ برطانوی راج کیا تھا؟ اس کی بنیادیں کیا تھیں؟ اور یہ کیوں اور کس طرح آج بھی ہماری سوچ پر حاوی ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی

لاہور

مئی 1999ء

فہرست

جلد یا بدیر ایک وقت آئے گا جبکہ دنیا یہ محسوس کرے گی کہ برطانیہ کا ذہنی اور علمی اقتدار ہندوستان سے کبھی زائل نہیں ہو گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم سے کچھ کوتاہیاں اور غلطیاں سرزد ہوئیں، کبھی کبھی جذبات کی رو میں ہم آپے سے باہر بھی ہو گئے اور بارہا ہم تنگ خیالی کے مرتکب ہوئے۔ ان سب کے باوجود ہم نے ہندوستان کو امن عطا کیا---- وہ امن جس کی بنیاد تباہ کاری پر نہ تھی---- ہم نے ہندوستان کو قانون دیا---- وہ قانون جس میں جبرو تشدد کو دخل نہ تھا____ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم نے ہندوستان کو آزادی کی دولت بخشی---- کیونکہ ملٹن، لاک، مل، برائٹ اور گلیڈ اسٹون کے اعلیٰ خیالات ہی کی بدولت سب سے پہلے ہندوستانیوں کے دماغ روشن ہوئے اور انہوں نے آزادی کے حقیقی مفہوم کو سمجھا۔

بیورلی نکلسن

فیصلہ ہندوستان

(Verdict on India)

یہاں پر انگریزوں کے بغیر بھی انگریزی راج رہے گا۔

گاندھی

تعارف

دنیا کی تاریخ میں غیر ملکی دور حکومت کو کئی نقطہائے نظر سے دیکھا گیا ہے۔ نو آبادیاتی نظام جن جن ملکوں میں بھی قائم ہوئے' وہ فتح کی صورت میں قائم ہوئے۔ وہ معاشرے جو طاقت ور اور سامراجی قوتوں کے ہاتھوں شکست خوردہ ہوئے' انہوں نے شکست کے بعد اپنی قوت و توانائی کھو دی' ان کی مزاحمت کی تحریکوں کو سختی سے کچل دیا گیا' ان پر نو آبادیاتی طاقتوں نے اس وقت تک حکومت کی جب تک رد عمل کے طور پر ان معاشروں میں دوبارہ سے طاقت و توانائی نہیں آگئی اور انہوں نے مزاحمتوں اور بغاوتوں سے نو آبادیاتی حکومت کو کمزور نہیں کر دیا۔

آزادی کے بعد جب تاریخ کو از سرنو تشکیل دیا جاتا ہے تو ان کے لئے نو آبادیاتی عہد باعث ندامت اور شرم ہوتا ہے۔ یہ انہیں شکست کی یاد دلاتا ہے۔ اس میں ان کی پس ماندگی' بے حسی' اور بے چارگی چھپی ہوتی ہے۔ اس میں ان کی غلامی کی زندگی پنہاں ہوتی ہے۔ ان حالات میں تاریخ کو دو طرح سے لکھا جاتا ہے: ایک تو یہ کہ ماضی سے سبق حاصل کیا جائے؟ اپنی شکست اور غلامی کا تجزیہ کیا جائے؟ اپنی پس ماندگی پر غور کیا جائے یا اپنی تہذیب و ثقافت کو دیکھا جائے تاکہ ایسے حالات دوبارہ سے پیدا نہ ہوں کہ جو انہیں پھر پس ماندگی اور غلامی کی طرف لے جائیں۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس عہد اور دور کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے' فراموش کر دیا جائے تاکہ شکست کا جو داغ ہے وہ نظر ہی نہ آئے۔ اس نقطہ نظر کو اہل اسپین نے اختیار کیا کہ جنہوں نے اسپین پر عربوں کی حکومت کو بالکل نظر انداز کر دیا اور اس دور کو اپنی تاریخ سے نکال کر اپنے تاریخی تسلسل کو جاری رکھا۔ یہی نقطہ نظر بلقان میں

عیسائی ریاستوں کا رہا کہ جنہوں نے عثمانی دور حکومت اور ان کی بالادستی کو فراموش کر دیا تاکہ غلامی کا یہ عہد ان کی تاریخ کا حصہ نہ رہے۔

آزادی کے بعد برصغیر کے مورخوں کے سامنے یہ ایک اہم مسئلہ ہے کہ ہندوستان میں برطانوی عہد کی تاریخ کو کس انداز اور کس طریقہ سے اپنی تاریخ کا ایک حصہ بنائیں۔ یہ تو ایک حقیقت ہے کہ یہ دور تاریخ کا حصہ ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ برطانوی اقتدار اور عمل دخل نے ہندوستان کی تاریخ کے تسلسل کو توڑا ہے۔ اس لئے یہ سوال کہ کیا اس عہد کو اسی طرح سے نظر انداز کر دیا جائے جیسا کہ اہل اسپین یا بلقان والوں نے کیا؟ یا اس کو تاریخ کا ایک اہم حصہ سمجھ کر اس کا تجزیہ کیا جائے۔ یہاں پر یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کو برصغیر کے تاریخی عمل میں محض دخل اندازی سمجھا جائے یا یہ دیکھا جائے کہ یہ محض دخل اندازی نہیں تھی بلکہ اس نے تاریخی تسلسل کو توڑ کر ایک نئے سلسلہ کی ابتداء کی' ایک ایسے سلسلہ کی کہ جو نوآبادیاتی دور کے خاتمہ کے بعد بھی کسی نہ کسی شکل میں آج بھی جاری ہے۔

یہاں پر ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہندوستان میں برطانوی اقتدار قائم نہیں ہوتا' اور ہماری تاریخ کا تسلسل برقرار رہتا اور اس تسلسل میں تبدیلیاں آتیں' روایات و اقدار اور اداروں میں شکست و ریخت ہوتی' ذہن بدلتا' پرانی عادات و رسومات میں تبدیلی آتی' اور اس طرح سے اندرونی طور پر معاشرہ اپنی ساخت و ہیئت بدلتا' تو اس پورے عمل میں ہمارے معاشرے میں اپنی تہذیب و ثقافت کی روح موجود رہتی۔ برطانوی عہد میں جو تبدیلیاں آئیں وہ باہر سے آئیں' اوپر سے آئیں۔ جب نئے اداروں کی تشکیل ہوئی' نئی روایات و اقدار بنیں' اور نئے ذہن کی تشکیل ہوئی تو اس نے ماضی سے ہمارا رشتہ توڑ دیا۔ اس نے معاشرہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا: ایک وہ جو جدید یورپی نظریات کو ماننے والے ہیں' دوسرے وہ جو اب تک قدیم ماضی سے جڑے ہوئے ہیں۔ ایک اپنے ماضی اور روایات کو حقارت سے دیکھتا ہے' دوسرا ان میں شان و شوکت اور افادیت ڈھونڈتا ہے۔ ایک یورپ کے ماڈل پر معاشرہ کی تعمیر

چاہتا ہے' تو دوسرا احیاء کے ذریعہ ماضی کو لوٹا کر اس میں مسائل کا حل تلاش کرتا ہے۔

غیر ملکی اقتدار کے بارے میں ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اگر نوآبادیاتی نظام ترقی یافتہ ہو تو یہ اپنے زیر دست ملکوں میں ترقی کے عمل کو تیز کر دیتا ہے اور نتیجتاً" معاشرہ ترقی کرتا ہوا اس مقام پر جلدی پہنچ جاتا ہے کہ جہاں وہ اپنی اندرونی جدوجہد اور عمل کے بعد پہنچتا۔ چنانچہ اس نقطہ نظر سے جب برطانوی عہد کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اس کی وجہ سے ہندوستان جدیدیت سے روشناس ہوا۔ مغربی تعلیم نے روشن خیال طبقے کو پیدا کیا۔ مشرقی علوم پر نئی تحقیق نے انہیں ایک نئی زندگی اور نئی جہت دی۔ یورپی سائنس' فلسفہ' اور دوسرے سماجی علوم نے عقلیت کو بڑھاوا دیا۔ مغربی تہذیب کی مادیت نے عام فرد کی زندگی میں خوش حالی و مسرت حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کیا۔ معاشرے میں نظم و ضبط کے اصول آئے جن کی بنیاد پر جماعتیں بنیں اور پھر متحد ہو کر جدوجہد کے اصول کو اختیار کیا۔ مغربی تہذیب کے زیر اثر ایسے نئے سیاسی ادارے بنے جن کی وجہ سے نچلے طبقوں کو ابھرنے کا موقع ملا۔ نئی تعلیم نے نئے نئے پیشے پیدا کئے جن میں ڈاکٹر' وکیل' صحافی' اور جج وغیرہ شامل ہیں۔

لیکن اس پر یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ تبدیلی کے اس عمل میں نوآبادیاتی حکومت کے اپنے مفادات تھے۔ اگرچہ ان کا فائدہ ہندوستانی معاشرہ کو بھی ہوا۔ مگر انہوں نے اپنی حکومت کے استحکام کو برقرار رکھنے کے لئے اونچی ذات کے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ مراعات دے کر انہیں اپنے ساتھ ملایا۔ اگر نوآبادیاتی نظام کے ہندوستانی معاشرے پر اس قدر گہرے اثرات ہوئے تو کیا ان تبدیلیوں نے معاشرہ کو ماضی سے کاٹ دیا؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے اولیوسس کہتا ہے کہ برطانوی اقتدار اور حکومت کے باوجود ہندوستان کا ماضی سے رشتہ نہیں ٹوٹا' بلکہ یہ رشتہ جڑا رہا۔ (1) اس ضمن میں وہ کہتا ہے کہ ہندوستان کا 1/3 علاقہ ہندوستان کے راجاؤں اور نوابوں کے پاس رہا جہاں قدیم ادارے اور روایات قائم رہیں۔ اس لئے ہندوستان برطانوی علاقوں

اور مقامی ریاستوں میں تقسیم رہا اور اس میں غیر مساویانہ ترقی ہوئی۔ برطانوی اقتدار کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ خانہ جنگیاں ختم ہو گئیں جس کی وجہ سے بیوروکریسی کی طاقت بڑھ گئی۔ اب یہ اصول مقرر ہوا کہ حکومت کرنے کے بجائے انتظام کرنا ہے جس کی وجہ سے جنگ جوؤں کی بجائے اب منتظمین اہم ہو گئے جن کا انتخاب تعلیم' صلاحیت اور قابلیت پر ہوتا تھا۔ (2)

نوآبادیاتی نظام میں بقول اولیوسس پرانی شراب نئی بوتلوں میں بھر دی گئی۔ جب انگریزی زبان سرکاری زبان بنی تو اس کے سیکھنے والے اونچی ذات کے برہمن اور کایستھ تھے۔ مسلمانوں میں بھی طبقہ اعلیٰ کے افراد نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ اس طرح مراعات اوپر کے لوگوں ہی میں محدود رہیں۔ تعلیم کے علاوہ تجارت میں میواڑی' پارسی' اور بنئے انگریزوں سے مل گئے اور ان کے لئے دلال یا ساہوکار کا کردار ادا کیا۔ زراعت کے میدان میں زمیندار اور جاگیردار ان کے معاون بن گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاجر اور زمیندار طبقے تبدیلی کے ایجنٹ نہیں بنے بلکہ انہوں نے نوآبادیاتی نظام کو مضبوط و مستحکم کیا۔ (3)

نوآبادیاتی دور میں انگریز حکمران طبقے نے مذہبی معاملات میں دخل اندازی سے پرہیز کیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی قوانین کا احترام کیا۔ سنسکرت زبان پر تحقیق' مستشرقین کا شاندار ماضی دریافت کرنا' ذات پات کی تقسیم کو برقرار رکھنا' آریہ نسل کی برتری کے نظریہ کو فروغ دینا' مندروں کی حفاظت کرنا' ان کے تہواروں میں شرکت کرنا' 1863 میں مندروں کو ریاست کے کنٹرول سے آزاد کر کے انہیں کمیٹیوں کے حوالے کرنا' یعنی برہمنوں کے تسلط میں دینا' ان تمام باتوں نے ہندو معاشرے میں برہمن ازم اور "ورن" کے نظریہ کو ایک نئی زندگی دے دی۔ (4) اس لئے نوآبادیاتی نظام میں جو تبدیلیاں نظر آتی تھیں۔ وہ سب سطحی تھیں' ورنہ معاشرہ انہیں قدیم اور فرسودہ بنیادوں پر قائم رہا۔

برطانوی عہد کے بارے میں ایک نقطہ نظریہ بھی ہے کہ اس دور میں مغربی اور

مشرقی افکار و خیالات کا ملاپ ہوا' اور اس ملاپ کے نتیجہ میں جو ثقافت ابھری اس نے ہندوستان کے منجمد معاشرے کو متحرک کیا۔ جب برطانوی اقتدار قائم ہو گیا' تو اس وقت ہندوستان کے دانشوروں کو یہ سوچنے کا موقع ملا کہ وہ ان وجوہات کو تلاش کریں جن کی وجہ سے انہوں نے انگریزوں سے شکست کھائی اور ان کے زیر دست ہوئے۔ اگر اس کی وجہ معاشرہ کی خرابیاں تھیں تو ان خرابیوں اور کمزوریوں کی نشان دہی کی جائے اور انہیں دور کیا جائے اور اصلاح کے ذریعہ معاشرہ کو بہتر بنایا جائے تاکہ وہ نئے اور بدلتے ہوئے حالات کا مقابلہ کر سکے۔ راجہ رام موہن رائے کی برہمو سماج اور سرسید کی تحریک اسی پس منظر کی پیداوار تھیں۔ ان تحریکوں نے ایک ایسا تعلیم یافتہ طبقہ پیدا کیا کہ جس نے اپنی سوچ کے معیار بدل ڈالے اور روایات و عقیدہ کے بجائے عقل و دلیل کے ذریعہ ہر چیز کو پرکھا جانے لگا۔ اس کی ایک مثال ہے کہ جب مولا سنکرا نامی ایک شخص نے ایک لاش کی مدد سے انسانی جسم کا مطالعہ کیا تو اس کو معلوم ہوا کہ مذہبی کتابوں میں انسانی جسم کی اناٹومی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ غلط ہے تو اس نے تجربہ کے بعد ان تمام مذہبی کتابوں کو پھاڑ دیا کہ جن میں غلط معلومات تھیں اور لاش کے ساتھ انہیں بھی دریا میں بہا دیا (5) اس کا یہ قدم علامتی تھا کہ اب ان کتابوں کی کوئی ضرورت نہیں' اب نئے حالات ہیں' نئی تحقیقات ہیں' انہیں میں سچائی ڈھونڈنے کی ضرورت ہے۔

اس لئے نوآبادیاتی دور کے بارے میں نہ تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے کوئی اثرات نہیں ہوئے اور قدیم معاشرہ اس طرح سے بغیر کسی حرکت کے مستحکم بنیادوں پر کھڑا رہا۔ نہ ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ نوآبادیاتی نظام انقلابی تبدیلیاں لایا اور اس نے ہندوستانی سماج کی ساخت کو بدل دیا۔ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس نظام نے ہندوستان میں تبدیلیاں ضرور کیں' مگر وہ یا تو برطانوی سامراج کے مفادات کے لئے تھیں۔ یا بلاواسطہ ان پالیسیوں کے نتیجہ میں رونما ہوئیں جو برطانوی حکومت نے نافذ کیں تھیں اور جن کا مقصد معاشرتی و سماجی تبدیلی نہیں تھا' مگر چونکہ ہر تبدیلی اپنے ساتھ ایک نیا

شعور لاتی ہے' اس لئے ہندوستانی معاشرہ جامد و ساکت نہیں رہا' وہ ان تبدیلیوں کو اپنے اندر ضم کرتا رہا۔

ان مختلف نقطہائے نظر کو سامنے رکھتے ہوئے یہ سوالات ابھرتے ہیں کہ آزادی اور آزادی کے تجربات حاصل کرنے کے بعد' اب ہم اس نوآبادیاتی نظام کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ کیا یہ ایک استحصالی نظام تھا کہ جس نے ہندوستان کی دولت اور سرمایہ کو لوٹا اور اسے پس ماندہ بنا کر رکھ دیا؟ یا اس کی وجہ سے ہندوستان جدید دور میں داخل ہوا اور اپنی فرسودہ اور قدیم روایات سے چھٹکارا حاصل کیا؟ اس لئے کیا یہ ایک لعنت تھا' یا نعمت؟ یہ وہ سوالات ہیں کہ جن کا جواب ڈھونڈنا اس لئے ضروری ہے کہ ہم نہ صرف اس سے ماضی کو سمجھیں گے بلکہ حال اور مستقبل کا بھی بہتر تاریخی شعور کے ذریعہ ادراک حاصل کر سکیں گے۔

جب ہندوستان میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف تحریک چلی تو اس کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ اس نظام نے ہندوستان کو اقتصادی اور معاشی طور پر مفلس و غریب اور پس ماندہ بنا دیا ہے۔ دادا بھائی نورو جی (1901ء) نے اس بات کی نشان دہی کی کہ انگریز ہندوستان سے دولت سمیٹ کر انگلستان لے جا رہا ہے جس کی وجہ سے یہ ملک اپنے ذرائع سے محروم ہو رہا ہے۔ اس سے ہندوستانی معاشرے کی مادی ترقی رک گئی ہے' اور لوگ دن بدن غریب و مفلس ہو رہے ہیں۔ آر۔ سی۔ دت نے اپنی مشہور کتاب "ہندوستان کی معاشی تاریخ" میں اس نقطہ نظر کو پیش کیا کہ نوآبادیاتی نظام نے کس طرح سے ہندوستان کی صنعتی ترقی اور پھیلاؤ کو روک دیا ہے اور اپنے مفادات کے تحت اسے غیر صنعتی بنا دیا ہے۔ مثال کے طور پر انہوں نے ہندوستان کی ٹیکسٹائل کی صنعت کا حوالہ دیا کہ جو ایک وقت یورپ سے زیادہ ترقی یافتہ تھی' مگر پھر اس صنعت کو کس طرح سے انگریز تاجروں نے اور بعد میں انگلستان میں ہونے والے صنعتی انقلاب نے تباہ کر دیا۔

نوآبادیاتی نظام کے خلاف معاشی نقطہ نظر نے اہل ہندوستان میں یہ شعور پیدا کیا

کہ ان کے ملک میں نہ صرف معاشی ذرائع ہیں بلکہ ان کو استعمال کرنے کی صلاحیت بھی ہے۔ اس سے انہیں اس بات کا بھی اندازہ ہوا کہ نوآبادیاتی نظام کس طرح سے ان کا معاشی استحصال کر رہا ہے۔ یہ وہ معاشی شعور تھا کہ جس نے آگے چل کر سیاسی تحریکوں کو پیدا کیا۔

یہ سیاسی تحریکیں اس طبقہ سے شروع ہوئیں جس نے جدید یورپی تعلیم حاصل کی تھی۔ اب ان کا مطالبہ تھا کہ انہیں حکومت کی ملازمتوں اور حکومتی اداروں میں حصہ ملنا چاہئے۔ اس مرحلہ سے انگریزی اقتدار کے خلاف جو تحریک شروع ہوئی وہ برابر پھیلتی رہی اور انگریزی حکومت کے استحصالی کردار کو اجاگر کرتی رہی۔

اس سیاسی تحریک کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جہاں ایک طرف انگریزی اقتدار کے خلاف جدوجہد جاری تھی' وہیں ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات پیدا ہوئے جنہوں نے ایک کش مکش اور تصادم کی شکل اختیار کر لی۔ ہندوستان کے قوم پرستوں کی پوری کوشش تھی کہ ہندو اور مسلمان بحیثیت ایک قوم کے متحد رہیں تاکہ سامراج کی بھرپور طریقہ سے مزاحمت کی جا سکے۔ مگر ہندو مسلم اتحاد میں جو تضادات ابھرے' ان میں سے اہم مسئلہ قوم پرستی کا تھا۔ ہندوستان میں انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے لئے اور بکھری ہوئی جماعتوں' گروہوں' اور برادریوں کو متحد کرنے کے لئے نظریہ قوم پرستی کی ضرورت تھی کہ جس کی بنیاد جغرافیائی حدود پر تھی۔ اس قوم پرستی کی جڑیں ہندوستان کے ماضی' اس کی تاریخ' اور اس کے کلچر میں تھیں۔ لہٰذا جب قدیم ہندوستان کی تاریخ اور کلچر کے احیاء کی تحریک چلی اور اس بنیاد پر ہندوستانی قوم پرستی کی تشکیل ہونا شروع ہوئی' تو مسلمانوں نے اس پورے عمل میں اپنے لئے کوئی جگہ نہیں پائی' کیونکہ ویدوں کے زمانے یا رام راجیہ میں ان کے لئے کوئی دلکشی نہیں تھی' اور نہ ہی اس میں ان کے لئے کوئی گنجائش تھی۔ اس لئے وہ اس قدیم تاریخ اور کلچر کو اپنانے کے لئے تیار نہیں ہوئے اور قدیم ہندوستانی تاریخ اور کلچر سے منہ موڑ کر اپنی جڑیں قدیم اسلامی تاریخ اور کلچر میں تلاش کرنا شروع کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تاریخ اور ان کا

کلچر ہندوستان سے باہر چلا گیا' اس طرح انہوں نے خود کو ہندوستان میں اجنبی بنا دیا۔ اسی کے بطن سے "دو قومی نظریہ" پیدا ہوا۔ اس نے مسلمانوں کی جدوجہد کا رخ انگریز سامراج سے موڑ کر ہندوؤں کی طرف کر دیا۔ علیحدگی' مذہبی شناخت' اور ہندو غلبہ سے نجات' ان کی سیاسی تحریکوں کا مقصد ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی پاکستانی معاشرے میں انگریز سامراج کے خلاف ایسے جذبات نہیں پائے جاتے جتنے کہ ہندوؤں کے رویہ کے خلاف جو کہ مسلمانوں کے ازلی دشمن کے طور پر ابھر کر آتے ہیں۔ اس پس منظر میں انگریزی اقتدار اور ان کی حکمرانی' ہندوؤں کی غلامی سے زیادہ اچھی نظر آتی ہے۔

پاکستان کے قیام کو ایک عرصہ گذرنے کے بعد جب ہم اپنی تحریک آزادی کا تجزیہ کرتے ہیں اور آزادی سے جو توقعات لوگوں نے وابستہ کیں تھیں ان کے بارے میں جائزہ لیتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ حقیقت ابھر کر آتی ہے کہ لوگوں نے آزادی سے جو توقعات وابستہ کیں تھیں' وہ پوری نہیں ہوئیں۔ 1947ء سے لے کر اب تک پاکستان میں جو حکومتیں آئیں انہوں نے نہ تو اس ملک کو سیاسی استحکام دیا' نہ ہی ملک کی معیشت کو سدھارا اور نہ ہی سماجی اور ذہنی طور پر ترقی کے راستوں کو ہموار کیا۔ اس پورے عرصہ میں ادب' موسیقی' فنون لطیفہ' سائنس اور ٹکنالوجی میں پاکستانی معاشرے نے کوئی تخلیقی کام نہیں کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرہ سیاسی' معاشی' اور سماجی طور پر برابر پس ماندہ ہوتا چلا گیا۔

اس پس منظر میں جب ہم برطانوی اقتدار اور حکومت کی تاریخ پڑھتے ہیں' اور ان لوگوں کے تاثرات سنتے ہیں کہ جنھوں نے انگریزوں کا زمانہ دیکھا تھا تو موجودہ حالات سے مقابلہ کرتے ہوئے انہیں وہ عہد اور زمانہ بڑا شاندار اور قابل تعریف نظر آتا ہے۔ انگریزی دور کی برکتیں اور زیادہ روشن ہو کر سامنے آتی ہیں۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں انصاف تھا' قانون کی بالادستی تھی' جرائم اور بدعنوانیاں کم تھیں' لوگوں کو سکون و اطمینان تھا اور وہ معاشی طور پر خوش حال تھے تو موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ ایک سہانا خواب معلوم ہوتا ہے۔ آج بھی وہ بزرگ اور بڑے بوڑھے جنھوں نے

اپنی زندگی کا کچھ حصہ انگریزی حکومت میں گزارا ہے' اس کو ترجیح دیتے ہوئے' موجودہ حکومتوں سے نالاں نظر آتے ہیں۔

انگریزی حکومت کی اہمیت' اس کی برکتیں' اور اس کی خوبیاں اس لئے اجاگر ہوئیں کیونکہ آزادی کے بعد ہماری حکومتوں نے اپنی پالیسیوں سے معاشرہ کو اور پس ماندہ بنایا۔ اب جیسے جیسے ہماری پس ماندگی بڑھے گی اسی طرح سے انگریزی حکومت کی برکتیں ہم پر اور زیادہ واضح ہوتی چلی جائیں گی۔ جیسے جیسے ہمارے حکمران بدعنوان اور کرپٹ ہوتے چلے جائیں گے اسی طرح سے انگریز افسروں اور عہدے داروں کی ایمانداری' محنت' کام کرنے کا جذبہ نمایاں ہوتا چلا جائے گا۔ جیسے جیسے معاشرے میں عوامی فلاح و بہبود کو پس پشت ڈال دیا جائے گا' اسی طرح سے انگریزی حکومت کی عوام دوستی' اور عوام کو دی جانے والی سہولتیں سامنے آتی چلی جائیں گی۔

اگر آزادی کے بعد ہمارے حکمرانوں نے ملک کی ترقی اور عوامی فلاح و بہبود کے لئے کام کیا ہوتا اور ترقی کے اس سلسلہ کو آگے بڑھایا ہوتا کہ جہاں یہ نوآبادیاتی دور میں رک گیا تھا' تو آج برطانوی عہد ہماری تاریخ کا ایک حصہ ہو کر ماضی میں روپوش ہو چکا ہوتا اور اس صورت میں وہ ایک مثالی یادگار دور بن کر ذہنوں میں نہیں آتا۔ ہمارے حکمرانوں کی بدعنوانیوں نے اسے روشن اور نمایاں کر دیا ہے۔

اس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ نوآبادیاتی نظام کے صرف مثبت پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کے جرائم' بدعنوانیاں' اور ان کے ظالمانہ سلوک کو فراموش کر دیا جاتا ہے۔ یہ بھی فراموش کر دیا جاتا ہے کہ انہوں نے کس طرح 1857ء میں معمولی سی خطاؤں پر معصوم لوگوں کو پھانسی پر لٹکایا' جلیانوالہ باغ میں قتل عام کرایا' سیاسی لوگوں کو کالے پانی بھیجا' جیلوں میں ان کو اذیتیں دیں' نسل پرستی کے نشہ میں ہندوستانیوں کو اپنے کلبوں سے دور رکھا' ریلوے کے ڈبوں سے انہیں باہر پھینکوایا اور اپنی رعونت سے انہیں ذلیل و خوار کیا۔ یہ سب اس لئے قابل معافی ہے کہ آج بھی عام لوگ اپنے ہی حکمرانوں کے ہاتھوں یہ سب ذلتیں اسی طرح سے برداشت کر رہے ہیں کہ جیسی

انہوں نے انگریزوں کے ہاتھوں برداشت کیں تھیں۔ اگر ان میں اور انگریز حکمران میں فرق ہے تو یہ کہ ہمارے حکمراں انصاف' ایمانداری' اور قانون کے احترام سے بھی عاری ہیں۔

اسی پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آج ہمارے معاشرے کی اکثریت اس پر متفق ہے کہ ہمارے حکمرانوں کے مقابلہ میں انگریز حکمران اور ان کی حکومت زیادہ بہتر تھی تو پھر آخر ان کے خلاف آزادی کی جنگ کیوں لڑی گئی؟ کیونکہ حالات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ جنگ ہماری فتح کی صورت میں نہیں بلکہ شکست کے طور پر ہمارے سامنے آئی ہے۔ اس صورت میں وہ تمام افراد اور شخصیتیں جو ہماری جنگ آزادی کی ہیرو ہیں' ان کا کردار بدل جاتا ہے کیونکہ انہوں نے ایک اچھے دور کا خاتمہ کر کے' بدعنوان اور کرپٹ راہنماؤں کو یہ موقع دیا کہ وہ حکومت کریں۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر ہمیں اسی نقطہ نظر سے اپنی تاریخ کی تشکیل کرنی ہو گی' اور پھر ہم اس نقطہ نظر کو اپنانے پر مجبور ہوں گے کہ جو انگریز کا تھا کہ اس کی حکومت کے خلاف جدوجہد کرنے والے ملک و معاشرے اور عوام کے دشمن تھے' آزادی کے علم بردار نہیں تھے۔ اس صورت میں آزادی کے لئے دی جانے والی تمام قربانیاں رائیگاں ہو جاتی ہیں۔ وہ قربانیاں بھی کہ جو عوام نے دیں۔ اس لئے آج یوم آزادی کو منانا' تحریک آزادی کے کارکنوں کی تعریف کرنا' انہیں انعام و اکرام دینا' یہ سب تاریخ کے خلاف ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس تاریخ کو تحریک آزادی کی تاریخ کہنا بھی غلط ہو جاتا ہے۔

برطانوی حکومت کے بارے میں جو تاثرات ابھر رہے ہیں وہ ہندوستان اور پاکستان میں علیحدہ علیحدہ نوعیت کے ہیں۔ آزادی کے بعد ہندوستان کے مورخوں نے نوآبادیاتی دور کی تاریخ کو نئے انداز سے تشکیل دیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے تاریخ کے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے کہ جو انگریزی دور میں نظرانداز کر دیئے گئے تھے۔ مثلاً سامراج کے خلاف جو مزاحمتی تحریکیں ابھر رہی تھیں اور جن کا ذکر تاریخ میں نہیں تھا' اب ان

تحریکوں کی تاریخ سامنے آ گئی ہے۔ تاریخ کے ان چھپے ہوئے گوشوں کو ابھارنے سے لوگوں میں سامراجی حکومت کے بارے میں صحیح شعور پیدا ہوتا ہے اور تاریخ کی تکمیل بھی ہو جاتی ہے۔ جب تاریخ کو مختلف نقطہ ہائے نظر سے لکھا جاتا ہے تو اس سے راہنماؤں اور جماعتوں کے کردار کو ہر پہلو سے دیکھا جاتا ہے' یہ سیاسی شعور کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ہندوستانی معاشرہ سامراجی دور سے آگے کی جانب دیکھ رہا ہے۔

اس کے مقابلہ میں پاکستان میں نوآبادیاتی دور کی تاریخ پر کوئی خاص کام نہیں ہوا جس کی وجہ سے اس دور کی تاریخ مکمل طور پر ہمارے سامنے نہیں آئی اور لوگوں کے سامنے انگریزی عہد کی تاریخ ہی ان کے ذہن کو بنا رہی ہے یا پھر وہ تاریخ جو اس وقت انگریز مورخ اپنے دفاع میں لکھ رہے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ لوگ اپنے حال کی روشنی میں ماضی کو دیکھتے ہیں۔ اس لئے جب تک ہم اپنے حال کو بہتر نہیں بنائیں' ہمارا ماضی' چاہے وہ غیر ملکی اقتدار اور سامراج ہی کیوں نہ ہو' وہ ہمیں شاندار' اور رومانوی نظر آئے گا۔

حوالہ جات

1_ Aloysius. G. Nationalism Without a Nation in India. Delhi, 1997. P. 34

2_ ایضاً: ص- 34

3_ ایضاً: ص- 44

4_ ایضاً: ص- 47

5_ Panikar, K. N. Culture, Ideology, Hegemony. Delhi, 1998, P. 83 (Footnote : 23)

برطانوی راج کا قیام

برصغیر کی تاریخ میں یہ سوال اہمیت کا حامل ہے کہ آخر وہ کون سی وجوہات تھیں کہ جن کی وجہ سے انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کر لیا؟ کیا اس میں زیادہ دخل ہندوستان کے اپنے سیاسی' معاشی اور سماجی حالات کا تھا' یا انگلستان میں ہونے والی تبدیلیاں تھیں کہ جن کی وجہ سے انگریزوں کو ہندوستانیوں پر فوقیت حاصل ہوئی' یا یہ محض حادثات اور اتفاقات کا نتیجہ تھا کہ انگریزوں کو مواقع ملتے چلے گئے اور وہ اپنا اقتدار بڑھاتے چلے گئے؟ ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا انگریزوں نے ہندوستان کی فتح کا پہلے سے منصوبہ بنایا تھا' یا یہ فتوحات بغیر کسی پلان اور منصوبے کے ہوئیں؟ اور یہ سوال بھی اہم ہے کہ کیا انہوں نے ہندوستان پر آسانی سے قبضہ کر لیا' یا انہیں مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا؟

یہ تمام سوالات اہمیت کے حامل ہیں : کیونکہ ان کے جوابات میں انگریزی اور ہندوستانی ذہنیت پوشیدہ ہے۔ اگر اس نظریہ کو مان لیا جائے کہ انگریزی اقتدار اس لئے قائم ہوا کہ مغل زوال نے ہندوستان کے معاشرے کو زوال پذیر بنا دیا تھا تو اس صورت میں انگریزی اقتدار کا آنا ایک منطقی نتیجہ ہو جاتا ہے کہ انہوں نے ایک ایسے خلا کو پر کیا کہ جس سے ہندوستان دوچار تھا۔ اس پر آگے چل کر بحث کی جائے گی کہ مغل زوال ہندستانی معاشرے کا زوال نہیں تھا' اس لئے انگریزی اقتدار کی یہ واحد وجہ نہیں تھی۔

انگریزوں کا ہندوستان میں آنا انگلستان کی اپنی داخلی تبدیلیوں کا نتیجہ تھا۔ ان کے ابتدائی مقاصد میں ہندوستان سے تجارت تھی۔ اس مقصد کے لئے وہ مغل حکمرانوں اور

ہندوستان کے علاقائی سربراہوں سے زیادہ سے زیادہ تجارتی مراعات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان مراعات کے لئے انہوں نے تمام حیلوں اور حربوں کو استعمال کیا جن میں خوشامد سے لے کر رشوت سب شامل تھیں۔

جب مغل شاہی خاندان کمزور ہوا اور طاقت و اقتدار ریاستوں اور علاقوں کے حکمرانوں کے پاس آیا تو ان کے درمیان ہونے والی خانہ جنگیوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو یہ مواقع فراہم کئے کہ وہ ان میں سے کسی کی حمایت و مدد کر کے اپنے لئے تجارتی فائدے حاصل کرے۔ اس ابتدائی دور میں کمپنی تجارت چاہتی تھی' جھگڑے نہیں' کیونکہ وہ فوج اور اس کے اخراجات برداشت کرنے کے قابل نہیں تھی۔ (1)

ہندوستان میں کمپنی کو فوج دو وجوہات کی بنا پر رکھنی پڑی : ایک تو اپنی تجارتی کوٹھیوں کی حفاظت کے لئے۔ کیونکہ اٹھارویں صدی میں جب مرکزی سلطنت ٹوٹی تو طاقت ور فوجی مہم جوؤں نے لوٹ مار شروع کر دی تھی۔ مثلاً شیوا جی نے کئی بار سورت شہر کو لوٹا (1664ء)_ اس وجہ سے انہیں فوج کی ضرورت پڑی جو اس لوٹ مار سے انہیں محفوظ رکھ سکے۔ دوسری وجہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی باہمی رقابت تھی جو یورپ اور امریکہ سے ہوتی ہوئی اور بعدازاں ہندوستان میں بھی آ گئی اور یہاں دونوں نے ایک دوسرے کی رقابت میں اپنی فوجوں کی تعداد بڑھائی اور وہ نئ ایجادیں جو سترہویں صدی میں یورپ میں ہوئیں' انہیں لے کر آئے خصوصیت سے فوجی تنظیم و ترتیب اور تکنیک۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں برطانوی حکومت اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے فرانسیسیوں کے خلاف فوجی اخراجات برداشت کئے۔ اس فوجی قوت کی بنا پر 1751ء میں مدراس میں کمپنی کے سربراہ نے یہ کہا کہ "ہندوستان میں مسلمانوں کی فوج اس قابل نہیں ہے کہ ہم سے مقابلہ کرے۔ ہم اگر چاہیں تو پورے ملک پر قابض ہو سکتے ہیں۔" (2)

1757ء میں پلاسی کی جنگ نے کمپنی کو ایک تجارتی ادارے سے سیاسی قوت بنا دیا۔ اس کے بعد سے اس کے مفادات تجارتی اور سیاسی دونوں ہو گئے۔ اب کمپنی نے

ہندوستان کے حکمرانوں سے معاہدے کرنے شروع کر دیئے۔

ضرورت پر انہیں سود پر قرضے بھی دیئے' اور ان کے علاقوں کی حفاظت کی خاطر فوج بھی مہیا کی' اگر فوج کے اخراجات نقدی کی صورت میں نہیں ملے تو انہوں نے اس کے عوض کچھ علاقے لے لئے تاکہ اس کے ریوینیو سے وہ اپنے اخراجات پورے کر سکیں۔ جب کمپنی کی فوج بڑھی تو اس کے اخراجات بھی بڑھے۔ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے مزید علاقوں پر قبضہ کیا۔ 1773ء میں بنگال میں دیوانی یا ریوینیو جمع کرنے کا حق اسے مل گیا۔ 1770ء کی دہائی میں اودھ کی حکومت دو بریگیڈ کا خرچہ برداشت کر رہی تھی۔ اس نے کچھ علاقے بھی کمپنی کو دے دیئے تھے۔ اپنے اقتدار کو مزید مستحکم کرنے کے لئے کمپنی نے ریاستوں سے کہا کہ وہ اپنی فوجیں ختم کر دیں' یا کم رکھیں' کیونکہ اب کمپنی ان کا دفاع کرے گی۔ اس پالیسی کی وجہ سے ریاستوں کے حکمران اس کے رحم و کرم پر ہو گئے۔ (3) اور اس طرح کمپنی ایک سیاسی قوت بن گئی۔

کوئی بھی سامراجی طاقت اس وقت تک اپنا اقتدار نہیں قائم کر سکتی جب تک مفتوح ملک میں اس کے ساتھ تعاون کرنے والے نہ ہوں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو ابتداء میں تو ان تاجروں' دست کاروں' اور ہنر مندوں سے تعاون ملا کہ جنہیں کمپنی کی تجارت سے فائدہ ہوا۔ ان میں وہ دست کار بھی تھے جو کمپنی کی ضروریات کے لئے اس کا مال بناتے تھے۔ اس کے بعد دلال اور ایجنٹ تھے جو کمپنی کے لئے کام کرتے تھے۔ مثلاً بنگال میں دیوانی کے بعد جو لوگ کمپنی کے ایجنٹ کی حیثیت سے مشہور ہوئے ان میں ہزاری مل' مہاراجہ نابھ کرشن' اور کرشن کانت بڑے مشہور ہوئے۔ ان لوگوں نے بہت دولت اکٹھی کی' یہ انگریزوں کو تحفہ تحائف بھی دیتے تھے اور سود پر قرضہ بھی۔ (4) پلاسی کی جنگ میں سراج الدولہ کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دینے والے بھی ہندو سیٹھ اور بنئے تھے کہ جن کے تجارتی مفادات نواب سے زیادہ کمپنی کے ساتھ ہو گئے تھے۔ ان میں سے مشہور جگت سیٹھ اور امی چند تھے۔

جب کمپنی کا اقتدار شمالی اور سنٹرل یا وسطی ہندوستان میں قائم ہوا تو اسے مغل انتظامیہ کے لوگ مل گئے جنہوں نے کمپنی کی ملازمت اختیار کرلی اور اس کے وفادار ہو گئے۔ انہیں میں مولانا فضل حق اور سرسید جیسے لوگ شامل تھے۔ اگرچہ مسلمانوں میں اس مسئلہ پر بحث ہوئی کہ کیا کمپنی کی ملازمت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مگر حالات کے تحت علماء اور ریوینیو کے منتظمین نے کہ جو بیروزگاری کے ہاتھوں پریشان تھے اور مغل حکومت کے زوال کے بعد ملازمتوں سے محروم تھے' ان کے لئے اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ کمپنی کی ملازمت کو مذہبی طور پر جائز قرار دے کر' اسے اختیار کر لیا جائے۔ اس لئے شاہ عبدالعزیز نے بھی یہ فتویٰ دیا کہ چند شرائط کے ساتھ کمپنی کی ملازمت کرنا جائز ہے۔ (5)

کمپنی کو اپنی فوج کے لئے سپاہیوں کے سلسلہ میں زیادہ مشکلات پیش نہیں آئیں۔ کیونکہ خانہ جنگیوں کے دوران گاؤں کے لوگ متاثر ہو رہے تھے کھیتوں کی پامالی اور لوٹ مار نے لوگوں کی بڑی تعداد کو بیروزگار کر دیا تھا' اس لئے جب انہیں کمپنی میں ملازمت کے مواقع ملے تو انہوں نے فوراً" اس سے فائدہ اٹھایا۔ کمپنی میں ملازمت کرنے والے فوجیوں اور سپاہیوں کو اس کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ کمپنی کی فتوحات کے نتیجہ میں ایک غیر ملکی اقتدار کو قائم کر رہے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ابتدائی دور میں کمپنی کے اعلیٰ عہدے دار تو سفید فام تھے' مگر نچلی سطح پر کہ جن سے عام فوجیوں کا سابقہ پڑتا تھا وہ ہندوستانی تھے' اس لئے انہیں ان سے رابطہ کرنے' بات چیت کرنے' اور احکامات ماننے میں تامل نہیں تھا۔ دوسرے شاید ان کے لاشعور میں یہ تھا کہ اس سے پہلے بھی غیر ملکی حملہ آور آتے رہے ہیں' مگر وہ اپنے ساتھ اپنی فوجیں لاتے تھے جیسے محمود غزنوی' محمد غوری' اور بابر' بعد میں فتوحات کے بعد ان کی افواج میں ہندوستانی بھی شامل ہو جاتے تھے۔ انگریزوں کے ساتھ صورت ہی دوسری تھی' یہ اپنے ساتھ کوئی فوج لے کر نہیں آئے تھے' البتہ یہ فوجی تکنیک اور نظم و ضبط کے طریقے ضرور لائے تھے' ان کی پوری فوج سوائے اعلیٰ افسروں کے' ہندوستانیوں پر مبنی ہوتی

تھی' اس لئے شاید انہیں یہ خیال نہ آتا ہو کہ یہ چند لوگ کس طرح سے ان کے بغیر صاحب اقتدار ہو جائیں گے۔ کمپنی کو اقتدار میں لانے کے سلسلہ میں شاید یہ پوشیدہ اور چھپا ہوا جذبہ بھی ہو کہ مغل سلطنت کے ٹوٹنے کے بعد جو چھوٹی ریاستیں وجود میں آئیں اور جو آپس میں جنگوں میں مصروف رہیں' انہیں ختم کر کے دوبارہ سے مغل طرز کی ایمپائر کو قائم کیا جائے تاکہ ہندوستان میں امن و امان ہو اور جنگوں سے نجات ملے۔ کمپنی کے پھیلاؤ اور اقتدار میں اس جذبے نے بھی شاید کام کیا ہو۔

غیر ملکی حکمرانوں کے سلسلہ میں اہل ہندوستان کا تجربہ یہ تھا کہ فتوحات کے بعد وہ باہر سے اپنے رشتہ' ناطہ توڑ دیتے تھے اور ہندوستانی ہو جاتے تھے۔ غزنویوں اور غوریوں کے عہد میں تھوڑے عرصہ غزنی فاتحین کا مرکز رہا' مگر دہلی اور لاہور نے جلد ہی اس کی جگہ لے لی۔ مغل تو ہندوستان میں اس وقت آئے کہ جب وہ وسط ایشیا سے اپنے تمام رشتے ختم کر چکے تھے۔ اس لئے شاید کمپنی سے تعاون کرتے ہوئے یہ خیالات بھی ہوں کہ فتوحات کے بعد انہیں یہیں کا ہونا ہے۔ لیکن انگریز دوسرے غیر ملکی فاتحین سے مختلف رہے۔ کیونکہ یہ فوجی مہم جو اور خودمختار فاتحین نہیں تھے' بلکہ کمپنی کے ملازم تھے' کہ جو انگلستان میں بورڈ آف کنٹرول اور بورڈ آف ڈائریکٹرز کے ماتحت تھے۔ اس لئے بحیثیت ملازمین انہیں انگلستان سے ہدایات لینی پڑتی تھیں اور اپنی ملازمت کی مدت پوری کر کے واپس جانا ہوتا تھا۔ اس وجہ سے ان کا کردار ماضی کے فاتحین سے مختلف تھا۔

شاید یہی وجہ ہو کہ ابتدائی دور میں کمپنی کے ملازم بے انتہا کرپٹ اور بدعنوان تھے۔ وہ ہر صورت میں زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھی کر کے واپس جانا چاہتے تھے۔ لیکن جب کمپنی کا سیاسی اقتدار مستحکم ہو گیا اور اسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ اب ہندوستان پر انہیں ہی حکومت کرنی ہے' تو اس کے رویہ میں تبدیلی آئی اور مختلف اصلاحات کے ذریعہ اس نے کمپنی سے بدعنوانیوں کو ختم کر کے اس کا ایک ایسا امیج بنایا کہ وہ ہندوستانیوں کے لئے قابل تعریف ہو گیا۔ اب اس کے ملازمین ایماندار' محنتی' اور بے

داغ کردار کے مالک تھے۔ بیورو کریسی کی ان اصلاحات کے ذریعہ کمپنی کے ملازموں پر یہ پابندی عائد کر دی گئی کہ وہ نجی تجارت نہیں کریں گے' مقرر شدہ تنخواہوں پر گذارہ کریں گے' رشوت سے پرہیز کریں گے' اور قانون کی پابندی کریں گے۔ (6)

تاریخی شواہد سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ جب یہاں پر انگریز تاجر آئے' یا ایسٹ انڈیا کمپنی تجارت کی غرض سے آئی تو ان کا یہ کوئی منصوبہ نہیں تھا کہ ہندوستان کو فتح کر کے اس پر اپنا اقتدار قائم کیا جائے۔ یہ حالات کا بہاؤ تھا کہ جس میں وہ الجھتے چلے گئے' اگرچہ انگلستان میں کمپنی کے اعلیٰ عہدے دار جنگوں اور فتوحات کے مخالف تھے اور ہندوستان میں تجارتی فوائد حاصل کرنے پر زور دے رہے تھے' مگر کمپنی کے مقامی ملازمین اور عہدے دار جب تجارتی فوائد کے لئے سیاست میں دخل انداز ہوئے تو اکثر فیصلے انہوں نے حالات کے تحت خود کئے۔ فاصلے کی وجہ سے وہ ہر معاملے میں فیصلہ کا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ لہذا 1784ء سے پہلے ہندوستان اور انگلستان میں کمپنی کے فیصلوں میں ہم آہنگی نہیں تھی۔ اس کے بعد سے بورڈ آف کنٹرول نے کوشش کی کہ وہ فیصلوں کے اختیارات حاصل کر کے ان پر عمل کرائے۔

یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان پر بغیر کسی مزاحمت کے قبضہ کر لیا۔ انہیں ہر علاقے پر قبضے کے لئے جنگ لڑنا پڑی۔ یہ مزاحمت افراد نے بھی' اور علاقے کے لوگوں نے بھی' اس لئے جب برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد ہوئی تو مزاحمت کرنے والے یہ افراد ہندوستان کی تاریخ میں ہیرو بن کر آئے۔ خاص طور سے 1857ء کی جنگ آزادی میں جنہوں نے برطانوی اقتدار کی مزاحمت کی۔ مزاحمت کی اس تاریخ سے اس مفروضہ کو غلط ثابت کیا گیا کہ اہل ہندوستان نے انگریزی اقتدار کو خوش آمدید کہا اور اسے خوشی سے تسلیم کر لیا۔

وانینا (Vanina) نے اپنی کتاب "سولہویں صدی سے اٹھارویں صدی تک ہندوستانی معاشرہ اور نظریات" میں اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ مغل زوال کے بعد ایک تو وہ ریاستیں تھیں کہ جو مغلوں کی وارث تھیں۔ ان میں حیدر آباد'

اودھ' اور بنگال قابل ذکر ہیں۔ ان ریاستوں نے سوائے بنگال کے انگریزوں کی معمولی سی مزاحمت کی ورنہ ان کی بالادستی کو تسلیم کر کے حکمران طبقوں نے اپنی مراعات بحال کر لیں۔ دوسری قسم میں مرہٹوں اور سکھوں کی ریاستیں تھیں کہ جنہوں نے انگریزوں سے سخت مقابلہ کیا اور خون ریز جنگوں کے بعد ہتھیار ڈالے اور پھر ان کے اقتدار کو تسلیم کیا۔ تیسری قسم میں میسور کی ریاست آتی ہے کہ جہاں حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے جدید اصلاحات کیں اور میسور کو ایک جدید ملک بنا دیا۔ اسی وجہ سے انگریز سب سے زیادہ اس سے خوف زدہ تھے۔ ٹیپو سلطان اس قابل تھا کہ وہ انگریزوں سے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکے۔ اس کی طاقت سے نہ صرف انگریز خوف زدہ تھے بلکہ مرہٹہ اور نظام حیدر آباد بھی' اس لئے ان تینوں کے ملاپ نے اسے شکست دی۔ مگر اس کی مزاحمت تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان آسانی سے فتح نہیں ہوا۔ (7)

ہندوستان میں برطانوی اقتدار اور اس کے پھیلاؤ کو مغل زوال کے پس منظر میں دیکھا جاتا ہے۔ اس سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ مغل زوال کے بعد ہندوستان کا معاشرہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر رہا تھا' اس کی معیشت تباہ ہو رہی تھی' اس کی اخلاقی اقدار گر رہی تھیں' اس کے سماجی اور ثقافتی ادارے ٹوٹ رہے تھے' اس کی معیشت ختم ہو رہی تھی۔ ان حالات میں جب طاقت و اقتدار کا خلا تھا' اس وقت انگریزی حکومت نے اسے پر کیا اور ہندوستان کے حالات کو سنبھالا۔ انہوں نے خانہ جنگی کو ختم کیا' ٹھگوں' ڈاکوؤں اور لٹیروں سے راستوں کو محفوظ کیا' ملک میں امن و امان کو بحال کیا اور ایک ایسی مضبوط ریاست کی بنیاد ڈالی کہ جس نے سیاسی و معاشی استحکام کو پیدا کیا۔

ہندوستان کے مورخوں نے زوال کے اس نظریہ پر کڑی تنقید کی ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق انگریزوں نے زوال کے بارے میں مبالغہ سے کام لیا ہے کیونکہ جتنا زوال اور اس کے نتائج کو بیان کیا جائے گا' اسی قدر انگریزی اقتدار کی اہمیت بڑھتی چلی جائے گی۔ اس لئے انہوں نے ہندوستان کی ایک تاریک تصویر کھینچی ہے کہ جس میں وہ

روشنی بن کر آتے ہیں اور زوال کے عمل کو روک کر یہاں استحکام پیدا کرتے ہیں۔

زوال کو درحقیقت مغل سلطنت کے زوال سے وابستہ کر کے دیکھنا چاہئے کہ جب اورنگ زیب (1707ء) کی وفات کے بعد تخت نشینی کے لئے خانہ جنگیاں ہوئیں' امراء کی گروہ بندیوں اور سازشوں نے ریاستی اداروں کو کمزور کیا' مخالفوں کو ختم کرنے کی غرض سے ایذا رسانی' قتل و غارت گری میں شدت آئی' ریاست کی کمزوری نے نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کو یہ مواقع دیئے کہ وہ بلا روک ٹوک آئیں اور یہاں لوٹ مار کریں' جب بادشاہ کی طاقت نہ رہی تو وہ کبھی مرہٹوں کا وظیفہ خوار ہوا تو کبھی کمپنی کا' ان حالات میں نہ مغل امراء کی جاگیریں رہیں اور نہ آمدنی' ان کی غربت اور مفلسی نے ان کے متوسلین کو بھی بیروزگار اور غریب کر دیا۔ ان کی سابقہ شان و شوکت اور غربت کا جب موازنہ ہوا تو لوگوں کے ذہن میں یہ تاثر ابھرا کہ معاشرہ زوال پذیر ہو رہا ہے۔ لیکن جو کچھ مغل بادشاہ' مغل امراء' اور دربار سے منسلک لوگوں کے ساتھ ہو رہا تھا' وہ پورے ہندوستان کو متاثر نہیں کر رہا تھا۔ دراصل مغل زوال کو دہلی دربار کے پس منظر میں دیکھا جاتا ہے اور اس کا پورے ہندوستانی معاشرے پر اطلاق کر دیا جاتا ہے۔

نئی تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ لکھنؤ' بنگال' حیدر آباد دکن' بیکانیر' جے پور اور پونا کی ریاستوں میں زندگی پورے جوش و خروش کے ساتھ جاری تھی۔ ان کے دربار سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز تھے۔ بقول گورڈن مرہٹہ سرکار کی پونا دستاویزات میں شہری و دیہاتی زندگی کی پوری تفصیلات موجود ہیں' ان سے کہیں یہ تاثر نہیں ابھرتا کہ ان علاقوں میں انتشار یا بدامنی تھی۔ اس وجہ سے برطانوی دور میں ان دستاویزات کو مورخوں کے لئے ممنوع قرار دے دیا گیا تھا کہ وہ ان سے استفادہ کریں۔ ان دستاویزات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مغل انتظام اور اس کے ادارے' اپنے زوال کے باوجود ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں کامیابی سے کام کر رہے تھے۔ (8)

انگریزی حکومت اپنے دور حکومت میں یہ کوشش کرتی رہی کہ وہ ان تمام تاریخی حقائق کو چھپائے رکھے جن سے زوال کا نظریہ متاثر ہوتا ہو۔ یہاں تک کہ 1917ء میں

بمبئ کے گورنر نے سی۔ اے۔ کن سیڈ (C. A. Kincaid) کو مرہٹہ تاریخ چھاپنے کی اجازت نہیں دی کیونکہ اس میں شیوا جی کے بارے میں اچھے ریمارکس تھے۔ (9)

نئ تحقیق اس کو بھی چیلنج کر رہی ہے کہ مغل دربار کا زوال مغل ریاستی اداروں اور روایات کا زوال نہیں تھا' کیونکہ جو خود مختار ریاستیں وجود میں آئیں انہوں نے اپنے اپنے علاقوں میں مغل نظام کو برقرار رکھتے ہوئے سیاسی استحکام پیدا کیا: مثلاً بنگال میں مرشد قلی خان اور علی وردی خان نے بہترین انتظام سلطنت کی بنیاد رکھی۔

سیاسی حالات نے ہندوستانی معاشرے کی ثقافتی تخلیقات کو نہ تو ختم کیا اور نہ ہی کمزور کیا۔ اس پورے عہد میں ہندوستانی معاشرہ اپنی ثقافتی صلاحیتوں کا اظہار کرتا رہا۔ ہرمن گوئٹز (H. Goetz) نے اپنی کتاب "اٹھارویں اور انیسویں صدیوں میں ہندوستانی تہذیب کا بحران" میں اس کا تجزیہ اس طرح سے کیا ہے کہ ہم ہندوستان کو 18 اور 19 صدیوں سے پہلے کی شان و شوکت کے پس منظر میں دیکھتے ہیں اور اس ضمن میں ان پہلوؤں کی طرف غور نہیں کرتے کہ جو ان دو صدیوں میں ثقافت کو ترقی دے رہے تھے۔

وہ لکھتا ہے کہ:

> لیکن اس طرح کی شان و شوکت اٹھارویں اور انیسویں صدیوں کے ہندوستان میں بھی موجود تھی۔ کیا ہم جے پور جودھپور' دیگ' اودے پور' لاہور' لکھنؤ' مرشد آباد اور پونا میں تعمیر ہونے والے خوبصورت اور پرشکوہ محلات کو نظر انداز کر سکتے ہیں؟ کیا ہم اس نازک اور پراحساس ذوق سے انکار کر سکتے ہیں کہ جو ہمیں اس عہد کے لاتعداد مرقعوں میں نظر آتا ہے؟ کیا ہم اردو' بنگالی اور مراٹھی ادب کے سنہری دور کو بھلا سکتے ہیں؟ کیا ہم اس پر شک کر سکتے ہیں رقص و موسیقی اسی دور میں اپنے عروج پر پہنچی؟ کیا ہم اس حقیقت سے منہ چھپا سکتے ہیں کہ جو سماجی زندگی

میں ادب آداب اور عورت کے احترام کی روایات اس عہد میں
پروان چڑھیں؟ کیا ہم اس نتیجہ پر نہیں پہنچتے کہ اٹھارویں اور
ابتدائی انیسویں صدی سیاسی و معاشی طور پر تو شاید زوال کے
ادوار ہیں' لیکن ہندوستانی ثقافت کی بلندی و عروج کے ادوار بھی
ہیں۔ (10)

مغل دربار کے زوال کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ جو ثقافتی سرگرمیاں دربار میں محدود تھیں' اب آزاد ہو کر ہندوستان کے دوسرے علاقوں اور ریاستوں میں پھیل گئیں کہ جہاں والیان ریاست نے ان کی سرپرستی کی۔ شاعروں' موسیقاروں' مصوروں' مورخوں اور دست کاروں کی سرپرستی کرنے والے امراء بھی تھے' راجے اور نوابین بھی۔ ہجرت اور نئے ماحول نے ان لوگوں کو نئے تجربات سے آشنا کیا اور تخلیقی کاموں کے لئے نئے موضوعات دیئے۔ ان ہجرت کرنے والوں میں اردو کے مشہور شاعر سودا اور میر تھے جو دہلی سے لکھنؤ آ گئے' مشہور مغل مصور مانک اور نین سکھ کے خاندان کانگڑہ چلے آئے۔ اس تبدیلی ماحول کی وجہ سے مغل مصوری راجپوت ریاستوں میں ایک نئے جذبہ کے ساتھ ابھری جیسے کشن گڑھ اور بوندی میں۔ (11)

معاشی طور پر بھی معاشرہ عدم استحکام سے متاثر نہیں تھا' اور پورے ہندوستان میں تاجروں کا کاروبار زور و شور سے جاری رہا۔ ریاستوں میں کپڑے' اسلحہ' زیورات' اور برتنوں کی مانگ تھی اس لئے دست کار و ہنر مند اپنے جوہر دکھانے میں مصروف تھے۔ کاروبار کی ترقی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مختلف علاقوں اور ریاستوں کے امراء اپنے ناموں سے بازار اور گنج تعمیر کرا رہے تھے۔

اس سے بھی زیادہ یہ بات اہم تھی کہ اس عہد میں لوگوں میں مذہبی تعصبات کم ہو رہے تھے۔ معاشی مفادات نے انہیں آپس میں ملا دیا تھا۔ نچلی سطح پر مذہب مقبول عام شکل میں ابھر رہا تھا جس میں پیروں' صوفیوں' سادھوؤں اور قلندروں کے اثرات تھے' مزاروں پر لوگ بغیر کسی امتیاز کے زیارت کے لئے جاتے تھے۔ ثقافتی طور پر ہندو

اور مسلمان تہواروں' رسومات' ادب آداب اور لباس ہم آہنگ ہو رہے تھے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ باہمی ملاپ اور ہم آہنگی سے ایک ایسا کلچر ابھر رہا تھا کہ جو مذہبی تعصبات سے بالاتر تھا۔

حوالہ جات

1. Marshau, P. J. Trade and Conquest. Aldershot 1993, P. 30

2_ ایضاً": ص- 36

3_ ایضاً": ص- 41

4_ ایضاً": ص- 103

5. Rizvi, A. A.: Shah Abd al_Aziz. Canbera 1982, P. 236

6. Metcalf, T.: The Ideologies of the Raj. Cambridge 1995, P. 23

7. Vanina, E.: Ideas and Scociety in India:

From the Sixteenth to the Eighteenth Centuries. Oup, 1996, P. 148

8. Gordon, S.: Marathas, Maraudens, and State

Formation in Eighteen Century India. Oup, 1994, P. X

9. Goetz, p. 6, 7, Quoted by Panikar: Culture,

Ideology, Hegemony. Delhi 1998. P. 38

10_ پانی کر: ص- 39

11_ پانی کر: ص- 39_40

ہندوستان کے بارے میں انگریزوں اور انگریزوں کے بارے میں ہندوستانیوں کی رائے

ہندوستان میں اپنی کامیابی' فتوحات اور اقتدار کے قائم ہونے کے بعد انگریزوں نے اپنی حکومت کے اخلاقی جواز تلاش کرنے شروع کئے تاکہ وہ یہ ثابت کر سکیں کہ ان کی حکومت کی حیثیت غاصب کی نہیں ہے اور نہ ہی انہوں نے اس اقتدار کو سازش یا حیلہ کے ذریعہ حاصل کیا ہے۔

اپنی کامیابی کی ایک دلیل تو یہ تھی کہ ہندوستان میں سیاسی انتشار' خلفشار اور بد امنی نے یہاں کے لوگوں کا چین و سکون برباد کر دیا تھا۔ بدامنی کو پھیلانے میں مرہٹوں' سکھوں' جاٹوں' روہیلوں اور پنڈاریوں کا ہاتھ تھا جنہوں نے ہر طرف لوٹ مار برپا کر رکھی تھی۔ ان کے حملوں سے نہ شہر محفوظ تھے اور نہ گاؤں۔ راستوں میں ڈاکوؤں اور ٹھگوں نے مسافروں اور تاجروں کے قافلوں کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔

اس انتشار' غیر یقینی' اور عدم تحفظ کی صورت حال نے لوگوں کے سماجی رویوں پر اثر ڈالا' اس سے ان کے آپس کے تعلقات پر فرق پڑا' جب سماجی تحفظات ٹوٹے تو لوگوں نے توہمات میں پناہ لی۔ قلندروں' پیروں' بھگتوں اور سادھوؤں کا اثر و رسوخ بڑھ گیا۔ معیشت کی تباہی نے امراء کو عام لوگوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ غربت و مفلسی نے لوگوں کی خودی اور انا کو بری طرح سے مجروح کیا۔

اس لئے انگریزی حکومت کی دلیل تھی کہ ان حالات میں جب انگریز ملک پر قابض ہوئے تو انہوں نے خانہ جنگی کا خاتمہ کیا' اور لوگوں کو ان کی خواہشات کے

مطابق امن و سکون اور تحفظ عطا کیا۔

انگریزوں کا ایک ایسا طبقہ تھا کہ جو یہ تسلیم کرتا تھا کہ ماضی میں ہندوستان نے ایک شاندار تہذیب پیدا کی۔ یہ وہ تہذیب تھی کہ جو ہزارہا سال کے طویل عرصے پر محیط تھی۔ اس تہذیب نے دنیا کی ثقافت اور ترقی میں جو حصہ لیا اس سے اس کی عظمت اور شان و شوکت کا احساس ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس تہذیب کو اس لئے زوال ہوا کہ اس کے وارث اس قابل نہیں رہے کہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے اس تہذیب کو نہ صرف قائم رکھیں' بلکہ اس میں اضافے کر سکیں۔ لہٰذا اب یہ ذمہ داری انگریزوں کی ہے کہ وہ اس عظیم تہذیب کے وارث کی حیثیت سے اس کو پس ماندگی سے بچائیں اور اس کی حفاظت کریں۔ ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ایڈمنڈ برک نے کہا کہ ہندوستان کا ماضی بہت قدیم ہے۔ اس لئے اس کا احترام کرنا چاہئے اور اس کی روایات و اداروں کے تحت باقی رکھنا چاہئے۔ ان کو تبدیل کرنا' یا ان میں رد و بدل کرنا انگریزی حکومت کے لئے ضروری نہیں ہے (1) اس قسم کے خیالات کا اظہار رچرڈ کونگ ریو (Richard Congreve) بشپ آف آکسفورڈ نے ان الفاظ میں کیا کہ خدا نے ہندوستان کو انگریزوں کے حوالے کیا ہے تاکہ وہ اس کی حفاظت کریں۔ انہیں یہ کوئی حق نہیں کہ وہ ہندوستان کو چھوڑ دیں یا اسے کسی اور کے حوالہ کر دیں۔ (2)

ہندوستان کی تہذیب کا وارث ہونے کے لئے ضروری تھا کہ اس تہذیب کے بارے میں معلومات اکٹھی کی جائیں اور اس کی تاریخ سے واقف ہوا جائے۔ اب تک ان کی معلومات سیاحوں کے سفر ناموں' مشنریوں کی تحریروں' اور تاجروں کی رپورٹوں تک محدود تھیں۔ جب ان معلومات میں خلا محسوس ہوتا تو اسے وہ فرضی تصورات سے پر کر لیتے تھے۔ اس لئے ان کی معلومات میں حقیقت و افسانے دونوں شامل تھے۔ لہٰذا اقتدار میں آنے کے بعد انہوں نے حکومتی ذرائع کو استعمال کر کے ہندوستان کے ماضی پر تحقیق شروع کی۔

ولیم جونز (1794ء_1746ء) جو رائل ایشیا تک سوسائٹی کا بانی تھا اسے ہندوستان

کے قدیم علوم اور زبانوں سے دلچسپی تھی۔ ان کے مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ماضی میں ہندوستانیوں نے علم و ادب' فلسفہ اور نیچرل سائنس میں اہم اضافے کئے تھے۔ ان کے ویدوں میں علم و دانش مندی کی باتیں ہیں' لہٰذا ان کو مدون کرنا ضروری ہے تاکہ علم کے یہ خزانے محفوظ رہیں۔ ان خیالات کے زیر اثر 1770ء اور 1780ء کی دہائیوں میں گورنر جنرل وارن ہسٹنگز نے ہندوستان کے قدیم ماضی کی تشکیل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

ہندوستان کے ماضی کی تحقیق کے بارے میں ولیم رابرٹ سن (W. Robertson) نے سامراجی عزائم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح سے انگریز اور یورپی مورخ قدیم یونان اور روم کی تاریخ پر تحقیق کر رہے ہیں' اسی طرح سے انہیں ہندوستان کے قدیم عہد کو ماضی کے دھندلکوں سے نکال کر حال کی روشنی میں لانے کی ضرورت ہے۔ ماضی کی اس تشکیل سے قدیم تہذیب و تمدن اور ان کی روایات کو نئی زندگی ملے گی اور اس قدیم تہذیب کی بنیاد پر جدید ترقی کے عمل کو جاری رکھا جا سکے گا۔ (3)

یہ محض علمی تحقیق اور جستجو ہی نہ تھی بلکہ اس کے پس منظر میں سیاسی مقاصد بھی تھے۔ ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے انگریزوں کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ اس ملک کی تاریخ' اس کی تہذیب و کلچر' اور لوگوں کی عادات و رسومات سے بخوبی واقف ہوں۔ اس مقصد کے تحت ہندوستان کے بارے میں مکمل معلومات کے لئے مختلف قسم کے سروے کرائے گئے جن کی وجہ سے برطانوی حکومت کے پاس ہندوستان کے مختلف علاقوں' اور دیہاتوں کے بارے میں تمام حقائق جمع ہو گئے۔ ان معلومات کی بنیاد پر حکومت کے لئے یہ آسان ہو گیا کہ وہ ہندوستانیوں کے ساتھ کیسا سلوک کریں' انہیں کیسے کنٹرول کریں' اور ان پر کیسے حکومت کا رعب و دبدبہ قائم کریں۔ (4)

کچھ برطانوی مفکرین برطانوی امپائر کو رومیوں سے ملاتے تھے کہ جنہوں نے وسیع بنیادوں پر ایک بین الاقوامی سلطنت قائم کی تھی۔ کچھ کا یہ خیال تھا کہ یہ ایک عیسائی سلطنت ہے جو کہ اصلاح پسند اور جمہوری ہے اور اس میں جو عیسائی مذہب کا عنصر ہے

اس کی وجہ سے خدا ہمیشہ اس کی مدد کرے گا اور یہ رومیوں کی طرح زوال پذیر نہیں ہو گی۔

اس کے مستقل طور پر قائم رہنے کی ایک دلیل یہ دی جاتی تھی کہ یہ دوسری سلطنتوں کی طرح فوجی قوت اور جبر کے ذریعہ قائم نہیں ہوئی ہے بلکہ اس کی بنیاد اصلاح پسندی پر ہے کہ جس کی حمایت پوری برطانوی قوم کی جانب سے ہے۔

رومی امپائر اور برطانوی سلطنت میں فرق کرنے والے یہ بھول جاتے تھے کہ رومی امپائر نسلی بنیادوں پر نہیں تھی۔ اس میں ہر ملک اور قوم کے لوگ شامل تھے۔ جب کہ برطانوی سلطنت کی بنیاد نسل پرستی پر تھی۔ اس وجہ سے انگریزی حکومت کے قیام میں جن افراد نے ہندوستانیوں پر مظالم کئے وہ انگریزی معاشرہ میں ہیرو بن گئے اور دلیل یہ دی گئی کہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ اپنے ملک کے لئے کیا۔ اس نسل پرستی کے جذبہ نے ہندوستان میں اسکاٹس' آئرش اور ویلز کے لوگوں کو ملا کر ایک کر دیا اور ہندوستان میں انہوں نے اپنے تضادات کو بھلا دیا۔

برطانوی راج کے بارے میں' برطانوی معاشرے میں اہل علم کی یہ رائے تھی کہ ان کا نظام اور حکومت فرانسیسیوں' ڈچوں' اور اہل بلجیم سے اچھی ہے کیونکہ یہ اپنی نوآبادیات کو توہمات سے آزاد کرا کے انہیں مہذب اور جدید بنا رہی ہے۔ اس بنیاد پر یہ حکومت ہمیشہ قائم رہے گی۔

قدامت پرست حلقوں کے خیال میں برطانوی نظام مضبوط اور طاقت ور اداروں پر قائم ہے۔ اس لئے یہ حکومت دنیا کے لئے ایک نعمت ہے۔ جب کہ لبرل حلقوں میں یہ سوچ تھی کہ برطانوی حکومت کے زیر اثر نوآبادیاتی معاشرے حکومت کے طور طریق سیکھیں گے اور ایک وقت آئے گا کہ جب یہ امپائر دولت مشترکہ بن جائے گی۔ (5)

ہندوستان میں آنے سے پہلے انگریزوں کو یہ تجربہ ہو چکا تھا کہ نوآبادیات کو کیسے کنٹرول کیا جائے۔ یہ تجربہ انہیں آئرلینڈ پر قبضہ کے بعد سے ہوا تھا۔ آئرلینڈ میں ان کی پالیسی یہ تھی کہ جبر' تشدد اور قوت کے ذریعہ ان کی آزادی کی جدوجہد کو ختم کیا

جائے۔ اس لئے یہاں انگریزوں کے خلاف جو بغاوتیں ہوئیں انہیں بے انتہا مظالم کے بعد کچل دیا گیا۔ دوسرا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ وہاں پروٹسٹنٹ لوگوں کو آباد کیا جائے تاکہ وہ آئرلینڈ کی کیتھولک آبادی کو کنٹرول کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام جاگیردار پروٹسٹنٹ بن گئے جب کہ کسان و کاشتکار آئرش رہے۔ آئرلینڈ کے اس تجربہ کی بنیاد پر انہوں نے نوآبادیات میں اپنی حکومت کے استحکام کے لئے ایسے قوانین بنائے کہ جن کے ذریعہ وہاں کے لوگوں میں اطاعت و فرماں برداری پیدا کی جائے اور ان میں بغاوت کے جذبات کو روکا جائے۔

لیکن کئی لحاظ سے وہ ہندوستان کو دوسری نوآبادیات سے مختلف درجہ دینے پر مجبور ہوئے' کیونکہ آسٹریلیا' امریکہ' یا نیوزی لینڈ کی طرح یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنی زائد آبادی کو ہندوستان میں منتقل کر سکیں۔ اس لئے ہندوستان ان کے لئے اس لحاظ سے فائدہ مند ہو سکتا تھا کہ اس کے ذرائع کو استعمال کیا جائے اور اس کو اپنی مصنوعات کے لئے بطور منڈی استعمال کیا جائے۔

ہندوستان میں اپنی فتح اور کامیابی کی وجوہات تلاش کرتے ہوئے یہ دلائل بھی دیئے گئے کہ وہ اس لئے کامیاب و فتح مند ہوئے کیونکہ نسلی طور پر وہ ہندوستانیوں سے برتر اور افضل تھے۔ مزید یہ کہ سائنس اور ٹکنالوجی میں بھی وہ ان سے بڑھے ہوئے تھے۔ اس لئے جب ان کی حکومت مستحکم ہو گئی تو انہوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ وہ کون سے عوامل اور کون سی پالیسی ہو کہ جن کی مدد سے وہ اس ملک پر ہمیشہ حکومت کر سکیں۔ اس سلسلہ میں جو منصوبے پیش کئے گئے ان ہی میں سے ایک یہ تھا کہ اگر ہندوستانیوں کو عیسائی بنا لیا جائے تو اس صورت میں وہ حکومت کے وفادار رہیں گے۔ مگر اس کے ردعمل میں یہ سوالات بھی آئے کیا ہم مذہب ہونے کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ برطانوی حکومت کو اپنا سمجھ کر اس کی ہمیشہ اطاعت کریں گے یا حالات کے تحت ان کی وفاداری متزلزل ہو جائے گی اور ایک وقت وہ آئے گا کہ جب وہ بغاوت پر آمادہ ہو جائیں گے۔

دوسرا طریقہ یہ تجویز کیا گیا کہ ہندوستان میں سماجی تبدیلیاں لائی جائیں' اصلاحات کی جائیں اور ان تبدیلیوں کے ذریعہ عام لوگوں کی زندگی کو بہتر بنایا جائے۔ جب لوگوں کی زندگی میں امن و امان اور خوش حالی آئے گی تو وہ احسان مند ہو کر حکومت کا ساتھ دیں گے۔

تیسرا طریقہ یہ تھا کہ ہندوستان میں تعاون کرنے والوں کی جماعتیں پیدا کی جائیں تاکہ وہ اپنا مفاد حکومت سے جوڑ لیں اور اس بنیاد پر اس کی حمایت کریں کہ اس کی کمزوری یا خاتمے کے نتیجہ میں وہ خود بھی اپنی حیثیت' مراعات' اور فائدے کھو دیں گے۔ ان میں زمیندار' جاگیردار' تاجر' اور مذہبی راہنما تھے اور ایک ایسا تعلیم یافتہ طبقہ جو ذہنی لحاظ سے مغربی تہذیب سے ہم آہنگ ہو اور ان کی حکومت سے تعاون کر کے اس کے استحکام میں مدد کرے۔

(2)

اس مرحلہ پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے لوگ انگریزوں اور انگریزی حکومت کے بارے میں کیا تاثرات رکھتے تھے؟ ہندوستان کے لوگوں کے لئے سفید فام ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں تھی کیونکہ ان کے اپنے بہت سے ایسے علاقے تھے کہ جہاں کے باشندوں کا رنگ بہت صاف ہوتا تھا۔ لیکن رنگ سے زیادہ ان کے لئے ان کا لباس اور حلیہ ہوتا تھا۔ اس لئے جب ابتداء میں پرتگیزی تاجر اور سیاح ہندوستان آئے تو وہ لوگوں کے لئے تجسّس کا باعث ہوئے۔ جب پرتگیزیوں کے علاوہ فرانسیسی' ولندیزی اور انگریز سفیروں' تاجروں' مشنریوں کی مغل دربار میں آمد شروع ہوئی تو لوگوں میں ان کے بارے میں جاننے اور ان سے ملنے کا شوق ابھرا۔ فادر مونسیراٹ جو 1580ء سے 1582ء تک اکبر کے دربار میں رہا اس نے لوگوں کے تجسّس کے بارے میں لکھا ہے کہ:

جب وہ شہر میں داخل ہوئے تو اپنے لباس کی وجہ سے تمام لوگوں

کی نگاہوں کا مرکز بن گئے۔ ہر شخص رک کر حیرانی سے دیکھتا تھا
کہ یہ غیر مسلح کالے لبادوں میں عجیب و غریب ٹوپیوں' شیو کئے
ہوئے چہروں اور منڈے سروالے لوگ کون ہیں؟ (6)

لیکن جب ان کی تعداد بڑھی تو لوگ ان کو دیکھنے کے عادی ہو گئے اور ایک حد تک ان کے مذہب اور ان کی رسومات کے بارے میں بھی واقفیت ہو گئی۔ جب اٹھارویں صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی ایک سیاسی طاقت کی حیثیت سے ابھری اور اس کی فوجیں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں جانے لگیں تو لوگوں میں ان کے بارے میں قیاس آرائیاں شروع ہو گئیں۔ لطف اللہ نامی ایک شخص نے اپنی آپ بیتی میں' جو اٹھارویں صدی کے حالات پر مبنی ہے انگریزوں کے بارے میں لکھا ہے کہ :

ساٹھ سال پہلے محمد شاہ کے دور حکومت میں کچھ غیر ملکی جو کہ
اپنی عادات و اطوار کے لحاظ سے ہم سے مختلف تھے ہندوستان میں
آئے اور یہاں بادشاہ کی کمزوری و عاملوں کے اختلاف و خانہ جنگی
سے فائدہ اٹھا کر اپنا اقتدار قائم کرنا شروع کر دیا۔ ان عجیب و
غریب لوگوں کے بارے میں طرح طرح کی باتیں مشہور تھیں۔
مثلاً یہ کہ ان کی کوئی کھال نہیں ہوتی ہے' بلکہ ایک باریک
غلاف سے ان کا جسم ڈھکا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ کراہیت
کی حد تک سفید نظر آتے ہیں۔ انہیں جادو ٹونا آتا ہے جس کی
وجہ سے وہ اپنی مہمات میں کامیاب ہو جاتے ہیں ..... اکثر باتیں
ان کے خلاف تھیں۔ مگر صرف ایک بات جو ان کے حق میں تھی
وہ یہ کہ وہ انصاف پسند ہیں۔ (7)

لطف اللہ کا جب پہلی مرتبہ ان سے واسطہ پڑا تو وہ لکھتا ہے کہ :

ایک دن جبکہ میں تفریح کی غرض سے شہر میں گھوم رہا تھا۔
اچانک میں نے چار اشخاص کو دیکھا کہ ان میں سے دو گھوڑوں پر

سوار تھے اور دو ان کے ساتھ پیدل جا رہے تھے۔ میں نے غور کیا تو ان کی رنگت ایسی ہی نظر آئی جیسا کہ میں اس سے پہلے سن چکا تھا۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کی زبان و لب و لہجہ مجھے انتہائی کرخت معلوم ہوا۔ وہ تنگ قسم کا لباس پہنے ہوئے تھے جس کی وجہ سے ان کی جسم کے وہ حصے نظر آ رہے تھے کہ جنہیں ڈھکنا ضروری ہے۔ میرا دل چاہا کہ میں ان کے پاس جا کر ان سے ملوں' لیکن اس لئے رک گیا کہ اجنبی شہر میں میرے جیسے کم عمر لڑکے کے لئے یہ مناسب نہیں ہے۔ بہرحال میں نے ہاتھ اٹھا کر انہیں سلام کیا۔ لیکن "اسلام علیکم" کے الفاظ ادا نہیں کئے کیونکہ میرا ایمان تھا کہ اس کا حق صرف مومنوں کو ہے۔ انہوں نے میرے سلام کا جواب بڑی شائستگی سے دیا' جس کی وجہ سے میرے دل میں ان کے لئے جو تعصب تھا وہ کم ہو گیا۔ (8)

انگریزوں کے بارے میں عام لوگوں کے خیالات و قیاس آرائیوں کے بارے میں سیتا رام نامی ایک شخص نے بھی بیان کیا ہے:

مجھے یہ بات اچھی طرح سے یاد ہے کہ جب ایک مرتبہ میں آگرہ میں ایک میلہ میں گیا ہوا تھا تو ایک بوڑھی عورت نے مجھے بتایا کہ وہ ہمیشہ سے یہ سمجھتی تھی کہ صاحب لوگوں کی پیدائش انڈوں سے ہوتی ہے جو کہ درخت پر لگے ہوتے ہیں۔ لیکن آج صبح اس نے ایک صاحب کو دیکھا ہے کہ جس کے ساتھ ایک پری بھی تھی اور یہ پری خوبصورت پروں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ دودھ کی طرح سے سفید تھا۔ صاحب نے اس کے شانوں پر اپنا ہاتھ رکھا ہوا تھا تاکہ وہ اڑ نہ جائے۔ یہ سب کچھ بوڑھی

عورت نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور وہ قسم کھا رہی تھی کہ یہ سب کچھ سچ ہے۔ لیکن میں نے اس وقت ان باتوں پر یقین کر لیا تھا کہ جب میں آگرہ میں تھا۔ لیکن اب میں ناواقف نہیں رہا ہوں۔ کیونکہ بعد میں میں نے ایک صاحب کو اپنی بیگم کے ساتھ گاڑی میں دیکھا جو کہ مور کے پروں کی جھالر والا ہیٹ اوڑھے ہوئے تھی۔ اس کو بوڑھی عورت نے اس کے پر سمجھ لئے تھے۔

(9)

پرکاش ٹنڈن نے اپنی کتاب "پنجاب کے سو سال" میں لکھا ہے کہ:

پرانے لوگ بتاتے ہیں کہ انگریزوں کو دیکھ کر پنجابی بڑے حیران ہوتے تھے۔ انہوں نے ایسے ناپسندیدہ لوگ پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ پنجابیوں نے پٹھان تو دیکھے تھے اور خود ان میں سے کئی لوگ گورے رنگ کے بھی ہوتے تھے ..... لیکن پنجابیوں نے انگریزوں جیسے ناقابل یقین حد تک سرخ چہرے نہیں دیکھے تھے۔ یہ لوگ عجیب و غریب قسم کا چست لباس پہنتے تھے جس میں بڑی بے حیائی سے ان کی پچھاڑیاں نظر آتی تھیں۔ پنجابیوں نے ایسی عورتیں بھی نہیں دیکھی تھیں جو عجیب قسم کا لباس پہنتی تھیں اور نقاب نہیں اوڑھتی تھیں۔ (10)

جیسے جیسے ایسٹ کمپنی کی طاقت بڑھتی رہی' انگریزی اقتدار مستحکم ہوتا رہا' اور لوگوں کا ان سے واسطہ پڑنے لگا تو ان کے بارے میں لوگوں کی رائے بھی بدلنے لگی' انہیں "صاحبان عالیشان" کے خطابات و القابات سے یاد کیا جانے لگا۔ جب ان کی حکومت اور ماضی کی حکومتوں کا تقابل ہوا تو لوگوں کو ان دونوں میں فرق نظر آیا۔ خاص طور سے وہ ہندوستانی کہ جنہوں نے کمپنی کی ملازمت اختیار کر لی تھی وہ انگریزوں کے طور طریق' عادتوں' اور ان کی انتظامی صلاحیتوں سے بڑے مرعوب ہوئے۔ وہ ان کے

ذاتی کردار کی بھی تعریف کرتے تھے اور بحیثیت قوم کے ان کی خوبیوں کے معترف تھے۔ ان کے نزدیک انگریزی حکومت ہندوستان کے لئے ایک نعمت تھی کہ جس کا انہیں شکر ادا کرنا چاہئے۔ سر سید احمد خان اپنی ایک تقریر میں کہ جو انہوں نے مئی 1866ء علی گڑھ میں کی۔ ماضی کی حکومتوں کا انگریزی دور سے مقابلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

> میں سمجھتا ہوں کہ اس زمانہ کی حکومتیں نہ مسلمانوں کی شرع کے مطابق تھیں اور نہ ہندوؤں کے دھرم شاستروں کے مطابق' البتہ زبردستی اور مردم آزادی کے قانون کی پابند تھیں۔ بڑا اصول ان وقتوں کی حکومتوں کا یہی تھا کہ جو زبردست ہے وہ کمزور پر غالب رہے اور جس طرح پر چاہے زیادتی اور جبر اور غضب سے صرف اپنے عیش و آرام کے لئے زیر دستوں کے حقوق کا تصرف کرے ..... مدت تک ہندوستان پر یہی زمانہ گذرا۔ پھر خدا کی مرضی ہوئی کہ ہندوستان ایک دانش مند قوم کی حکومت میں دیا جائے جس کا طرز حکومت زیادہ تر قانون عقلی کا پابند ہو۔ بے شک اس میں بڑی حکمت خدا تعالٰی کی تھی' کیونکہ جب ہندوستان میں مختلف قوم اور مختلف مذہب کے لوگ آباد تھے تو اس خدا کو جو کرسچین کا بھی ایسا ہی خدا ہے جیسا کہ ہندو مسلمان کا' ضرور ایسی حکومت ہندوستان میں قائم کرنی چاہئے تھی جو زیادہ تر عقلی قوانین حکومت کی پابند ہو۔ (11)

راجہ رام موہن رائے جو برہمو سماج کے بانی تھے وہ بھی اس کے حامی تھے کہ انگریز قوم میں سیاسی آزادی اور عوامی فلاح و بہبود کے جذبات ہیں۔ اس وجہ سے نہ صرف یہ کہ ان کا معاشرہ ترقی کر رہا ہے' بلکہ ان سے وہ اقوام بھی فائدہ اٹھا رہی ہیں جو ان کے زیر اثر ہیں۔ انگریز جہاں جاتے ہیں وہ آزادی' حریت' ادبی و علمی تحقیق و جستجو

اور مذہبی جذبات کو پیدا کرتے ہیں۔ وہ اس کے حامی تھے کہ یورپین لوگوں کو ہندوستان میں زمین و جائیداد خریدنا چاہئے کیونکہ وہ ذرائع پیداوار بڑھانے کی جدید تکنیک سے اہل ہندوستان کو روشناس کرائیں گے۔ اپنے مزارعوں سے بہتر سلوک کریں گے' اور ان کی محنت اور صلاحیت سے ملک کی معاشی حالت بہتر ہو گی۔ (12)

انہیں خیالات کا اظہار ایک اور راہنما کشب چندرا نے کیا کہ ہندوستان میں انگریزوں کا آنا خدا کی حکمت عملی ہے۔ وہ ان کے ہاتھوں اپنے مقاصد کی تکمیل کر رہا ہے۔ اس لئے اہل ہندوستان کو انگریزی حکومت کے قیام پر شکر گزار ہونا چاہئے۔ (13)
پرکاش ٹنڈن نے بھی انگریزوں کے بارے میں پرانی نسل کے تاثرات کو بیان کیا ہے کہ ان کے لئے کیوں نئی اور غیر ملکی حکومت باعث رحمت تھی:

> میرے والد بتاتے تھے کہ وہ بھی اگرچہ امن کے زمانہ میں ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ مگر ان کے بزرگوں کے لئے امن کا قیام بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ سکھ حکومت کے خاتمہ پر بنیادی حقوق اور جان و مال کا تحفظ جیسے تصورات اجنبی تھے۔ صرف اس نسل کے لوگ ہی محسوس کر سکتے تھے کہ برخواست شدہ یا سبکدوش سکھ سپاہیوں کے گروہوں کی لوٹ مار سے بچنا کتنا سنگین مسئلہ تھا ..... لیکن اچانک ہی سکھ سپاہیوں نے لوٹ مار ترک کر دی۔ اس لئے کہ ان کو روزگار مل گیا ..... برطانوی سپاہی سادہ تھے۔ وہ مفت چیزیں نہیں اٹھاتے تھے ان کی پوری قیمت دیتے تھے ..... وہ نسل ان کی غیر مشروط تعریفیں کرتی تھی۔ میرے والد کی نسل بھی ان برکتوں کی معترف تھی۔ (14)

ابتدائی زمانہ میں انگریزی حکومت کے قیام اور اقتدار کے بارے میں جو تاثرات انگریزوں اور ہندوستانیوں کے ملتے ہیں ان میں کافی مماثلت نظر آتی ہے۔ مثلاً حکومت کے بارے میں یہ رائے کہ یہ خدا کی جانب سے تھی' اس لئے اسے خدا کی حمایت و

حفاظت حاصل تھی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ رعایا کو ان کی اطاعت کرنی چاہئے' کیونکہ اس حکومت سے مزاحمت کرنا یا بغاوت کرنا' خدا سے بغاوت کے مترادف ہو گا۔ کمپنی کی حکومت کا یہ نظریہ' نظریہ بادشاہت تھا کہ جو خود کو ظل الٰہی سمجھتا تھا' اب یہ کمپنی کے حوالہ سے ایک نئی شکل میں سامنے آیا اور انگریزی حکومت ہندوستانیوں کی حامی و محافظ ہو گئی۔

دوسری بات جو دونوں جانب سے ملتی ہے وہ یہ تھی کہ انگریزوں نے ہندوستان کو امن دیا' ملک کو خانہ جنگیوں اور غیر ملکی حملوں سے بچایا۔ امن کا یہ تصور ان لوگوں کے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا' جیسا کہ پرکاش ٹنڈن نے لکھا ہے کہ جنہوں نے 18 ویں صدی میں خانہ جنگیوں اور لوٹ مار کے تجربے حاصل کئے تھے۔

ایک اور مشترکہ خیال یہ تھا کہ انگریزوں نے یہاں عدل و انصاف قائم کیا۔ یہ بھی ان لوگوں کے ذہن کی پیداوار ہے کہ جن لوگوں نے مغل زوال کے بعد اور ریاستی ڈھانچہ کے ٹوٹنے کے بعد جو افراتفری دیکھی تھی' اس کی وجہ سے انہیں انگریزی سلطنت میں عدل و انصاف اور قانون کا نفاذ بڑا اچھا نظر آیا۔ ہندوستانی اس کے بھی قائل تھے کہ انگریزوں کے مقابلہ میں وہ غیر مہذب' جاہل اور پس ماندہ تھے' اس لئے انگریزوں کا یہاں آنا باعث رحمت ہوا' اب ان کی حکومت کے زیر سایہ تعلیم و تربیت کے ذریعے ہندوستانی بھی مہذب اور شائستہ ہو جائیں گے۔ وہ انگریزوں کے غیر ملکی ہونے کو بھی خرابی کا باعث نہیں سمجھتے تھے' کیونکہ ہندوستان میں اس سے پہلے بھی غیر ملکی آتے رہے تھے اور یہاں پر حکومت کرتے رہے تھے۔ اس کے برعکس ان کا خیال تھا کہ چونکہ یورپ کی تہذیب اس وقت عروج پر تھی اس لئے انگریزی حکومت کے نتیجہ میں ہندوستان بھی یورپی تہذیب سے روشناس ہو گا اور جدیدیت اختیار کر کے ترقی کرے گا۔

لیکن جہاں ایک طرف انگریزی حکومت کے قیام و اقتدار کو ہندوستان کے لئے باعث نعمت کہا جا رہا تھا' وہاں اس حکومت کے خلاف بھی لوگوں کے دلائل تھے۔ لیکن

ایک ایسے ماحول میں کہ جب حکومت اپنی پوری طاقت سے لیس ہو' اس کے حق میں بولنے والوں کو خیالات کے اظہار کی زیادہ آزادی ہوتی ہے بہ نسبت ان کے کہ جو اختلاف رکھتے ہوں۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ اہل ہندوستان کو یورپیوں کے عزائم کا علم نہ تھا' ایسے لوگ موجود تھے کہ جو یورپیوں کی آمد اور ان کی تجارتی سرگرمیوں کے پردہ میں ان کے سیاسی ارادوں کو بخوبی دیکھ رہے تھے۔ ان ہی میں سے ایک اٹھارویں صدی کے مفکر رام چندر پنت امتیا تھے جنہوں نے اپنی کتاب "اجن پترا" میں لکھا ہے کہ:

> پرتگالی' انگلش' ولندیزی' فرانسیسی' اہل ڈنمارک اور دوسرے ٹوپی والے تاجر ہندوستان میں مصروف تجارت ہیں۔ لیکن وہ دوسرے تاجروں کی طرح نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے حکمرانوں کے ملازم ہیں۔ وہ ان کی ہدایات اور احکامات پر عمل کرتے ہوئے یہاں کے علاقوں میں تجارت کی غرض سے آتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ان حکمرانوں کو علاقوں پر قبضہ کرنے کی خواہش نہ ہو؟ ان ٹوپی والوں کے عزائم ہیں کہ وہ علاقوں میں داخل ہوں اور پھر ان پر قبضہ کر کے اپنے مذہب کو پھیلائیں۔ کچھ جگہوں پر تو وہ کامیاب بھی ہو چکے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ نسل بڑی سرکش ہے۔ جب وہ کسی جگہ پر قبضہ کر لیتے ہیں تو پھر اس کو چھوڑتے نہیں ہیں۔ چاہے اس میں ان کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ اس لئے ضروری ہے کہ تجارت کے سلسلہ میں ان پر آنے جانے پر پابندی عائد کی جائے۔ انہیں سمندروں کے قریب تجارتی کوٹھیاں بنانے کی قطعی اجازت نہ ہو' بلکہ ان سے کہا جائے کہ وہ یہ کوٹھیاں شہروں کے اندر بنائیں جہاں پر لوگ ان پر نظر رکھ سکیں۔ خیال رہے کہ ان کی اصل طاقت ان کی بحریہ میں ہے .....

اگر وہ محض تجارت کی غرض سے آتے ہیں۔ اور ہمیں پریشان نہیں کرتے ہیں' تو ہم بھی ان کو بلا وجہ پریشان نہیں کریں گے۔ (15)

انیسویں صدی میں بنگال میں جہاں راجہ رام موہن رائے انگریزی حکومت کی حمایت کر رہے تھے۔ وہاں وہ لوگ بھی تھے کہ جو اس حکومت کے منفی اثرات دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے اکثر اپنے خیالات کا اظہار پمفلٹوں یا اخباروں میں بغیر نام دیئے کرتے تھے۔ مثلاً اس قسم کا ایک خط مہاراشٹر کے اخبار ریفارمر میں چھپا کہ:

اگر ہندوستان کا انحصار اپنے فاتحین اور قابض لوگوں پر نہیں ہوتا تو آج ہماری سیاسی صورت حال بالکل بدلی ہوئی ہوتی اور ہندوستان کے لوگ پہلے سے زیادہ قابل عزت' دولت مند اور خوش حال ہوتے۔ اس کی مثال امریکہ سے دی جا سکتی ہے کہ اس کی اس وقت کیا حالت تھی کہ جب وہ انگلستان کے ماتحت تھا اور آج کیا ہے کہ جب وہ آزاد ہے۔ (16)

اسی قسم کا ایک خط 1841ء میں "بمبئی گزٹ" میں چھپا۔ اس میں کہا گیا کہ برطانوی حکومت دوسری غیر ملکی حکومتوں سے مختلف ہے۔ مسلمان حکمرانوں کے عہد میں انصاف تھا اور رعایا کے ساتھ مساوی سلوک ہوتا تھا' جبکہ انگریزی حکومت میں ہندوستانیوں اور یورپیوں کے لئے علیحدہ علیحدہ قوانین ہیں' ملازمتوں میں تخصیص کی جاتی ہے' ہندوستان کی دولت باہر منتقل ہو رہی ہے۔ جب کہ اس سے پہلے کے حکمرانوں نے یہ نہیں کیا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ برطانوی ہندوستانی ثقافت اور روایات سے بہت دور ہیں' انہیں اس کی خواہش نہیں کہ ہندوستان میں رہتے ہوئے ہندوستانی طور طریق سیکھیں۔ (17)

انگریزی حکومت اور انگریزوں کے بارے میں خیالات کا یہ تضاد کئی وجوہات کی وجہ سے تھا۔ بی۔ آر۔ نندا کے مطابق ابتدائی نسل کے وہ لوگ کہ جنہوں نے انگریزی

حکومت میں معمولی ملازمتیں کیں تھیں' وہ برطانوی منتظمین اور افسروں کی صلاحیتوں سے بڑے متاثر ہوئے اور ان کی یہ خواہش تھی کہ انگریز اپنے انتظام سے اس ملک کو بہتر بنائیں۔ لیکن بعد میں جب انگریز تعلیم یافتہ طبقہ وجود میں آیا کہ جو یورپی تہذیب' افکار و خیالات سے واقف تھے' تو انہوں نے حکومت کی ملازمت کے بجائے وکالت یا پڑھانے کے پیشے اختیار کئے۔ اس لئے ان میں حکومت کا رعب و دبدبہ نہیں تھا اور وہ آزادی سے اس کی مخالفت کر سکتے تھے' ان راہنماؤں میں دادا بھائی نوروجی' فیروز شاہ مہتہ' اور سریندر ناتھ بینرجی قابل ذکر ہیں۔ (18)

انگریزی حکومت کے ان متضاد خیالات و آراء سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ ہندوستانی معاشرے نے انگریزی حکومت کو بلا سوچے سمجھے تسلیم نہیں کر لیا تھا' بلکہ اس کے برعکس وہ اس کی خوبیوں اور خرابیوں دونوں پر غور بھی کر رہے تھے' اور ساتھ ہی کسی نئے راستہ کی تلاش میں بھی تھے۔ یعنی ہندوستانی معاشرہ کی اصلاح کیسے کی جائے؟ کیا اسے یورپ کے ماڈل پر ڈھالا جائے یا قدیم روایات سے رشتہ جوڑتے ہوئے آگے بڑھایا جائے؟ انہیں رجحانات نے قدامت پرستی اور روشن خیالی کی تحریکوں کو پیدا کیا۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ذہنی لحاظ سے اہل ہندوستان منجمد نہیں تھے بلکہ وہ سوچ رہے تھے' فکر مند تھے' اور ترقی کے لئے نئی راہیں تلاش کر رہے تھے۔

حوالہ جات

1. Bearce, G. D.: British Attitudes towards India, 1784_1858. Oxford, 1961, P. 17_18

2. Nandy, Ashish : The Intimate Enemy. OUP, 1994, P. 34.

3. Bearce, P. 24

4_ مزید مطالعہ کے لئے دیکھئے:

Bayly, C. A.: Empire and Information. Cambridge 1996.

5. Marshall, P. J. Trade and Conquest. Aldershot 1993, P. 173

6_ مونسیرات : اکبر کا ہندوستان (اردو ترجمہ : ڈاکٹر مبارک علی) لاہور۔ 1999ء_ ص 52

7_ لطف اللہ : لطف اللہ کی آپ بیتی (ترجمہ : ڈاکٹر مبارک علی) لاہور 1996ء ص۔ 35

8_ ایضاً : ص۔ 38

9. Sita Ram: From Sepoy to Subedar. London 1970, P. 13

10_ پرکاش ٹنڈن : پنجاب کے سو سال (اردو ترجمہ : رشید ملک) لاہور 1996ء ص۔ 14

11_ سرسید : خطبات سرسید' جلد اول' لاہور 1972ء' ص۔ 107_106

12_ پانی کر۔ ص۔ 73

13_ ایضاً۔ ص۔ 72

14_ ٹنڈن۔ ص۔ 15

15. Vanina, P. 162

16_ پانی کر : ص۔ 74

17_ ایضاً : ص۔ 75

18. Nanda, B. R.: Gandhi and Pan_Islamism, Imperialism and Nationalism, OUP 1989, P. 53

برطانوی راج اور نسل پرستی

نوآبادیات کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جب سامراجی طاقتیں کسی ملک میں جاتی ہیں تو ابتدائی دور میں انہیں اس بات کی سخت ضرورت ہوتی ہے کہ وہ مقامی لوگوں سے مدد کے طلب گار ہوں' چونکہ ابتدائی دور میں ان کے سامراجی عزائم بھی واضح نہیں ہوتے اس لئے وہ مقامی لوگوں کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں اور جب انہیں ان کا تعاون بھی ملتا ہے تو یہ رائے اور زیادہ مستحکم ہو جاتی ہے۔ لیکن جیسے جیسے ان کی طاقت بڑھتی جاتی ہے' مقامی لوگ اور قومیں شکست خوردہ ہوتی جاتی ہیں' ان کی کمزوریاں ان پر واضح ہوتی جاتی ہیں' اسی طرح سے ان کا رویہ بھی بدلتا رہتا ہے' اور وہی لوگ کہ جو اب تک نیک' رحمدل' نرم مزاج' اور خوش باش و تعاون کرنے والے تھے' اب وہ غیر مہذب' وحشی' جاہل اور بد سرشت ہو جاتے ہیں۔

نوآبادیاتی طاقتیں' مقامی لوگوں کو انسانیت کے درجہ سے گرا کر انہیں وحشی اور جانوروں کی صف میں لا کر اخلاقی طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ وہ مہذب' برتر' اور افضل ہیں اس لئے خدا نے انہیں فتح دی ہے اور ان لوگوں کو ان کی ماتحتی میں دیا ہے۔ برتر اور اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے یہ ان کا اخلاقی فرض ہے کہ ان کی زمین پر قبضہ کریں' ان کی جائیدادوں کو ہتھیا لیں' ان کے مال اور ان کی دولت کو چھین لیں' اور انہیں مجبور کریں کہ وہ ان کے مقاصد کے تحت کام کریں۔ اگر مقامی لوگ ان کے منصوبوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں' ان کی حکومت کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں تو یہ نہ صرف سامراجی طاقت سے غداری ہے بلکہ خدائی احکامات کی بھی خلاف ورزی ہے' لہٰذا اس صورت میں ان کو قتل کرنا' اذیت دینا' اور سزا دینا اخلاقی طور پر صحیح ہو جاتا

ہے۔

جب کولمبس اتفاقاً" نئی دنیا میں پہنچتا ہے (اس کو دریافت کہنا اس لئے غلط ہے کہ یہ پہلے ہی سے دریافت ہو چکی تھی) تو اہل ہسپانیہ کو مقامی باشندے بڑے بھلے' رحم دل اور معصوم نظر آتے ہیں۔ سب سے زیادہ تعجب انہیں اس بات پر ہوا کہ ان کے پاس ہتھیار بھی نہیں تھے۔ مگر جب اہل ہسپانیہ بڑی تعداد میں سونے اور مال و دولت کی تلاش میں وہاں جاتے ہیں تو اس کے حصول میں مقامی باشندوں کا قتل عام ہوتا ہے' اس وقت یہ لوگ وحشی' غیر مہذب اور غیر متمدن قرار دے دیئے جاتے ہیں۔ چونکہ ایسے نکمے لوگوں کو اس صفحہ ہستی سے مٹانے پر کسی تاسف کی گنجائش نہیں ہوتی ہے' اور نہ ہی ان کو قتل کرنے میں کوئی اخلاقی چبھن ہوتی ہے۔ جیسے جیسے ہسپانوی نئی دنیا میں آتے گئے' زمینوں پر قبضہ کی ہوس بڑھتی گئی' اس طرح سے مقامی لوگ ان کے ظلم و ستم کا شکار ہوتے چلے گئے۔ (1)

ان حالات میں یہ بھی کوشش کی جاتی ہے کہ ان کا مذہب تبدیل کر کے' انہیں ہم مذہب بنا لیا جائے اور پھر اپنی تہذیبی روایات میں شامل کر کے ان کی اپنی ذات اور شناخت ختم کر دی جائے۔ اس سلسلہ میں خیال کیا جاتا تھا کہ اس سے ان کی مزاحمت ختم ہو جائے گی اور وہ سامراجی طاقت کا حصہ بن کر عضو معطل اور بیکار ہو جائیں گے۔

چونکہ سامراجی طاقت کے لئے ایک بڑی آبادی کو قتل کرنا' یا بالکل ختم کرنا مشکل ہوتا ہے اس لئے وہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد اس قسم کے منصوبے بناتی ہے کہ جس میں آبادی کو محنت مزدوری میں مصروف رکھا جائے۔ اگر وہ ان کے منصوبوں کی مزاحمت کرتے ہیں تو پھر انہیں کاہل و سست قرار دے کر ان کے خلاف طاقت و قوت کا استعمال کیا جاتا ہے۔

اس تمام پس منظر میں سامراجی حکومت اپنے بارے میں یہ تاثر قائم کرتی تھی کہ وہ عدل و انصاف کی حامی ہے' اس کے کارکن اور منتظمین ایماندار' محنتی' اور کام کرنے والے ہیں' وہ اس لئے حکومت کر رہے ہیں تاکہ مقامی لوگوں کو مہذب بنائیں'

اور ان کی زندگی کو پرسکون و پرامن بنا دیں۔ اچھے و برے' کمزور و برتر' ادنیٰ و اعلیٰ' غیر مہذب و مہذب اور سست و کام کرنے والے کا یہ فرق محکوم و حاکم کے درمیان قائم کرنے کے بعد ان کے لئے حکومت کرنے کا اخلاقی جواز پیدا ہو جاتا تھا جو اپنے ذاتی مقاصد سے بڑھ کر اعلیٰ و ارفع مقاصد کے لئے حکومت کر رہے تھے۔

اس پس منظر میں جب ہم ہندوستان میں انگریزوں کے رویوں میں تبدیلی کے عمل کو دیکھتے ہیں کہ جو انہوں نے مقامی لوگوں کے سلسلہ میں کیا' تو ہمیں ان کے سامراجی ذہن اور ہندوستان کے حالات میں تبدیلی کے عمل کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

ابتدائی دور میں انگریز بحیثیت تاجر' مشنری' سفیر' سیاح' اور مہم جو کے آئے۔ اس لئے بحیثیت تاجر ان کا مقصد یہ تھا کہ مغل حکومت سے زیادہ سے زیادہ تجارتی سہولتیں حاصل کریں۔ اس مقصد کے لئے وہ دربار میں امراء کی حمایت حاصل کرتے تھے اور ان کی سفارش کی غرض سے انہیں تحفہ تحائف اور رشوتیں دیتے تھے۔ مشنری کی حیثیت سے ان کی کوشش تھی کہ بادشاہ یا امراء کو عیسائی بنا لیں تاکہ حکومت کی طاقت انہیں مل جائے اور اس کی مدد سے وہ لوگوں کو عیسائی بنا سکیں۔ سفیر اور سیاح بھی تاجروں کے لئے مراعات حاصل کرنے آتے تھے۔ مہم جوؤں میں وہ لوگ تھے جو مغل فوج کے توپ خانہ میں ملازم تھے یا کرایہ کے فوجیوں کی حیثیت سے ہندوستان کے حکمرانوں کے ہاں ملازمتیں کرتے تھے۔ اس ابتدائی دور میں وہ درخواست گزار' اور مراعات حاصل کرنے والے ہوتے تھے' اس لئے ان کا رویہ عاجزانہ اور خوشامدانہ ہوتا تھا اور ہندوستان کے حکمران طبقوں میں ان کے لئے کوئی زیادہ عزت و احترام نہیں تھا۔ وہ انہیں معمولی تاجر یا معمولی سیاح و نوکری کے خواہش مند' اور مذہبی لوگ سمجھتے تھے۔

جب مغل سلطنت زوال پذیر ہونا شروع ہوئی تو اس وقت سیاسی انتشار و خلفشار اور ابتری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک بڑی تعداد میں یورپی مہم جو کہ "جن میں انگریز بھی شامل تھے' ہندوستان آئے تاکہ حالات سے فائدہ اٹھا کر دولت اکٹھی کی جائے۔

اٹھارویں صدی میں یورپ کے تربیت یافتہ فوجیوں کی ہندوستان کی ریاستوں میں بڑی مانگ تھی کیونکہ خیال یہ تھا کہ یہ فوج کو یورپی طریقوں سے منظم کر کے ان کا تحفظ بھی کریں گے اور دشمنوں کے خلاف بھی کار آمد ثابت ہوں گے۔ چنانچہ ان یورپی فوجی مہم جوؤں کو مرہٹہ سرکار، سکھ دربار، اور دوسری ریاستوں میں اہم عہدے دیئے گئے۔ ان میں سے اکثر نے تو ریاستوں کی ملازمت کی مگر کچھ ایسے بھی تھے کہ جنھوں نے خود اپنی فوج تیار کر کے لوٹ مار شروع کر دی۔ ان ہی میں سے ایک انگریز جارج ٹامس تھا۔ جس نے ہریانہ کے علاقہ میں جارج گڑھ کے نام سے اپنا قلعہ بنایا، اپنا سکہ جاری کیا، اور بحیثیت خود مختار حکمراں کے اس علاقہ میں کچھ عرصہ حکومت کی۔ (2)

اس ابتدائی زمانہ میں یورپیوں اور ہندوستانیوں میں ایک دوسرے کے خلاف تعصبات نہیں تھے۔ بلکہ یورپیوں کے لئے ضروری تھا کہ اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لئے خود کو ہندوستانی کلچر اور ثقافت میں ضم کر دیں۔ کیونکہ ان لوگوں کا تعلق اور رابطہ طبقہ اعلیٰ کے لوگوں سے ہوتا تھا اس لئے یہ ان کے کلچر کو اپنا لیتے تھے۔ یہ کلچر خود انہیں ہندوستانی معاشرے میں ایک اعلیٰ مقام دے دیتا تھا۔ اس لئے ان کا لباس، کھانا، موسیقی اور رقص یہ سب ہندوستان کے ماحول کے مطابق ہو جاتے تھے۔ یہ ہندوستانی عورتوں سے شادی کرتے تھے۔ طبقہ اعلیٰ کے ادب آداب کو اختیار کرتے تھے۔ فارسی و اردو زبانیں نہ صرف بولتے تھے بلکہ کچھ تو ان زبانوں میں شاعری بھی کرتے تے۔ جب فرینکلن نامی ایک سیاح نے جارج ٹامس سے انٹرویو لیا تاکہ وہ اس کی سوانح لکھے تو اس وقت تک وہ انگریزی سے زیادہ اچھی فارسی بولتا تھا۔ ان میں سے اکثر کے نام بھی ہندوستانی ہو گئے تھے جیسے جارج ٹامس، جہازی صاحب، یا "جارج بہادر" اسکنر، سکندر صاحب، اور روبرٹ سنڈر لینڈ، ستلج صاحب، بن گئے تھے۔ (3)

ہندوستان کے لوگ اور ان کی تہذیب و ثقافت کے بارے میں پلاسی کی جنگ (1757ء) کے بعد بھی انگریزوں کا رویہ مخالفانہ یا معاندانہ نہیں تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اکثر ملازمین پندرہ سال کی عمر میں ہندوستان آتے تھے۔

اس وقت تک ان کی عادتیں پختہ نہیں ہوتی تھیں' ان کے لئے یہ آسان تھا کہ نئے ملک میں نئے حالات کے تحت وہ یہاں کے طور طریق اور عادتوں کو اختیار کر لیں۔ دیوانی ملنے کے بعد ایک تو انہیں نئے انتظامی امور سے ناواقفیت کی بنا پر' ہندوستانی عہدے داروں اور ملازمین کے ساتھ کام کرنا ہوتا تھا جو انہیں انتظامی معاملات سکھاتے تھے' اس لئے بحیثیت استاد اور ماہر کے وہ ان کا احترام کرتے تھے' انہیں مقامی زبانیں' خصوصیت سے فارسی بھی سیکھنا پڑتی تھی' جو انہیں مقامی لوگ اور استاد سکھاتے تھے۔ اس لئے جب انتظامی امور کے لئے انہیں بنگال و اڑیسہ کے علاقوں میں جانا ہوتا تو ان کا واسطہ ایک طرف زمینداروں اور شرفا سے پڑتا تھا' ان سے تعلقات اور رابطوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ ان سے بات چیت کرنے اور معاملات طے کرنے کے لئے ہندوستانی ادب آداب اختیار کریں۔ (4) دوسرے وہ عام لوگوں سے ملتے تو انہیں کی زبان میں بات کرتے تھے جس کی وجہ سے غیر ملکی ہونے کا فرق کم ہو جاتا تھا۔ اس عہد میں مقامی زبان نے انگریزوں اور مقامی لوگوں کو باہمی ملانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ کیونکہ زبان کے ساتھ ہی ہندوستانی کلچر بھی آیا' اس نے ان میں برتری کے جذبات پیدا نہیں ہونے دیئے بلکہ وہ ثقافتی طور پر معاشرے میں مل گئے۔

پلاسی کی جنگ کے بعد کمپنی کے ملازمین میں ایک طرف تو دولت اکٹھی کرنے کا رجحان پیدا ہوا' اس مقصد کے لئے انہوں نے نجی تجارت' رشوت اور دوسری بدعنوانیوں کے ذریعہ مال و دولت جمع کرنا شروع کر دی' اس کے ساتھ ہی ان میں دوسرا یہ رجحان پیدا ہوا کہ ہندوستانی معاشرے میں عزت و احترام حاصل کرنے کے لئے مغل دربار سے خطابات حاصل کئے جائیں تاکہ وہ بھی ہندوستانی امراء کی طرح سے معزز اور افضل بن جائیں۔ یہی وہ طبقہ تھا کہ جو اپنی دولت اور خطابات کے ساتھ واپس انگلستان گیا تو وہاں "نو باب" کے نام سے مشہور ہوا۔ (5) انہیں لوگوں کی لوٹ کھسوٹ کے واقعات سے متاثر ہو کر ایڈمنڈ برک نے کہا تھا کہ کمپنی کی حکومت بنگال میں اپنے کارکنوں کے ظلم و ستم سے لوگوں کو بچائے (6) آگے چل کر جب ان ابتدائی دور کے

انگریزوں اور ان کے کردار کی خامیوں پر روشنی ڈالی گئی تو اس کا الزام بھی مقامی لوگوں پر لگایا گیا کہ کردار کی خرابی دراصل ہندوستانیوں کی تھی کہ جسے انگریزوں نے بھی اختیار کر لیا اور اپنے معمولات اور معاملات میں ان جیسے بن گئے۔ ایک انگریز مؤرخ ٹریولین (Trevelyn) لکھتا ہے کہ :

> ابتدائی انگریز' ست و کاہل اور عیاش تھے' انہوں نے مشرق کی تمام عادتوں کو اپنے کردار میں سمو لیا تھا' یہاں تک کہ مذہبی معاملات میں بھی وہ مشرک و کافر ہو گئے تھے۔ لیکن ان کے بعد آنے والی ہر نسل زیادہ سے زیادہ سادگی پسند' کام کرنے والی' اور مذہبی طور پر اچھی عیسائی ہوتی چلی گئی۔ (7)

ابتدائی دور کے انگریزوں کے خراب کردار کا یہ پس منظر بتایا گیا کہ چونکہ مشرق میں حکومت مطلق العنان تھی' لہٰذا اس کی پیروی کرتے ہوئے کمپنی کے ملازمین بھی بدعنوان ہوتے چلے گئے۔ لہٰذا اصل خرابی کمپنی کے ملازموں کی نہیں بلکہ ماحول کی تھی۔

گورنر جنرل وارن ہسٹنگز تک انگریزوں اور ہندوستان کے طبقہ اعلیٰ میں سماجی طور پر مساوی تعلقات رہے۔ ان دونوں کے درمیان نہ صرف علمی گفتگو و بحث و مباحثے ہوتے تھے' بلکہ سیر و تفریح میں بھی ایک دوسرے کا ساتھ دیتے تھے۔ اس وقت تک انگریز ہندوستان کے ماضی اور اس کی تاریخ سے متاثر تھے۔ ایڈمنڈ برک کا کہنا تھا کہ اس قوم میں خرابیاں ہو سکتی ہیں' لیکن ہم اس قابل نہیں کہ ان لوگوں کے بارے میں اپنی کوئی رائے دیں یا فیصلہ سنائیں' کیونکہ انہوں نے ہم سے بہت پہلے اپنے قوانین تشکیل دیئے اور ادارے بنائے۔ (8)

انگریزوں کے رویہ میں آہستہ آہستہ اس وقت سے تبدیلی آنا شروع ہوئی کہ جب ان کی طاقت و اقتدار مستحکم ہوتا چلا گیا' وہ ہندوستان کی تاریخ' جغرافیہ' لوگوں کی عادات و اطوار اور رسم و رواج سے واقف ہوتے چلے گئے اور اس مرحلہ پر پہنچ گئے کہ جہاں

انتظامی امور میں انہیں ہندوستانیوں کی مدد کی زیادہ ضرورت نہیں رہی اس کے ساتھ ساتھ نوآبادیاتی ریاست کا ڈھانچہ بھی ضرورت کے تحت بدلتا رہا' ایسے قوانین تشکیل دیئے گئے کہ جن سے ہندوستانیوں کو کم واقفیت تھی۔ لہٰذا طاقت و اقتدار' ملکی ذرائع' اور فتح کے تاثر نے ان میں رعونت' برتری' اور فوقیت کے احساسات کو پیدا کیا۔ اب ہندوستانیوں سے سماجی طور پر مساوی اور برابری کے رشتہ کی ضرورت نہیں تھی' بلکہ یہ رشتہ فاتح و مفتوح اور حاکم و محکوم کا ہو گیا۔

اپنے اس رعب و دبدبہ کو قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ یہ ثابت کیا جائے کہ ہندوستان کی تہذیب ان سے کم تر ہے اور ہندوستانی لوگ غیر مہذب اور وحشی ہیں۔ چونکہ اب تک خود یورپی مورخوں نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ہندوستان کا ماضی شاندار رہا ہے اور اس نے ایک عظیم تہذیب تخلیق کی تھی۔ اس لئے اس سے تو انکار ممکن نہیں تھا' اس لئے دلیل یہ دی گئی کہ ہندوستان کی قدیم تہذیب معہ اپنی شان و شوکت کے ایک جگہ ٹھٹھر کر رہ گئی' اب نئی نسل کا اس تہذیب سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے' وہ ماضی سے اپنا رشتہ توڑ چکی ہے' ان کے اور ماضی کے درمیان جو فاصلہ پیدا ہوا ہے اس دوران یہ اپنی تمام تخلیقی صلاحیتیں کھو کر اپنے تمام تہذیبی ورثہ سے محروم ہو گئے ہیں۔ بقول اشیش نندی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ سنسکرت کا مشہور عالم میکس ملر خود کبھی ہندوستان نہیں آیا' اور نہ ہی اپنے طالب علموں کو ہندوستان جانے کے لئے کہا: کیونکہ اس کے نزدیک ماضی اور حال کا ہندوستان دو مختلف شکلیں تھیں۔ اس لئے جو قدیم ہندوستان سے متاثر ہیں انہیں جدید ہندوستان میں ماضی کی کوئی روایت نظر نہیں آئے گی۔ (9)

اہل ہندوستان کو نفسیاتی طور پر کم تری کا احساس دلانا اس لئے بھی ضروری تھا کہ اگر انہیں برتری' یا برابری کا احساس ہوتا تو وہ برطانوی حکومت سے مزاحمت کے لئے تیار رہتے' جب ان کے حقوق کو غصب کیا جاتا' تو ان کی واپسی کا مطالبہ کرتے' جب ان کی بے عزتی کی جاتی' تو احتجاج کرتے' جب ان کو دبایا اور کچلا جاتا' تو بغاوت کرتے۔

اس لئے ان میں تہذیبی کم تری کے احساسات پیدا کرنا ضروری تھا تاکہ وہ حکومت اور اس کے عہدے داروں سے مرعوب رہیں' ان کی اطاعت کریں اور ان سے کسی قسم کے مطالبات نہ کریں بلکہ اگر کچھ حاصل کرنا ہو تو اس کے لئے ان سے درخواست کریں' اگر ان کی درخواست منظور ہو جائے تو ان کے شکر گزار ہوں۔

گورنر جنرل کارنوالس (93_1783ء) نے وارن ہسٹنگز کی پالیسی کی سخت مخالفت کی اور کمپنی کے ملازموں میں کردار کی خرابی کو مشرقی روایات و اقدار کی پابندی کرنے کی وجہ بتایا۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ کمپنی کے ملازموں کی اصلاح قانون اور اصولوں کی بنیادوں پر ہونی چاہئے۔ ان میں بدعنوانیوں کا خاتمہ کر کے ایمانداری اور کردار کی بلندی پیدا کرنی چاہئے تاکہ وہ ہندوستانیوں سے مختلف نظر آئیں۔ جہاں تک ہندوستانیوں کا تعلق ہے تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہئے۔ (10)

کارنوالس نے اس پالیسی کو اختیار کیا کہ اعلیٰ عہدوں پر صرف انگریز اور یورپین لوگوں کو رکھا جائے۔ کیونکہ اگر ہندوستانی اعلیٰ عہدوں پر رہیں گے تو وہ دوسروں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ کر انہیں بدعنوان بنا دیں گے' اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اخلاقی طور پر پس ماندہ ہیں' ناچ گانے و اصراف میں مبتلا ہیں' اس لئے اس قابل نہیں کہ ان سے میل ملاپ رکھا جائے۔ اس لئے انہیں صرف نچلے عہدوں پر مقرر کر کے بطور ماتحت کام کرایا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کا واسطہ صرف نچلے درجہ کے ملازموں سے رہ گیا اور وہی لوگ ہندوستانی کلچر کے نمائندے بن گئے۔ (11)

ہندوستانیوں کے بارے میں انگریزوں کے خیالات دن بدن خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔ اس کا تجزیہ جان شور (John Shore) نے کیا ہے کہ جو ہندوستان میں کمپنی کے اعلیٰ عہدیدار سے گورنر جنرل تک مختلف حیثیتوں میں کام کرتا رہا (1837ء_1799ء) اس کا کہنا ہے کہ کمپنی کے عہدیدار کم عمری میں ہندوستان آتے ہیں اس وقت تک ان کا تجربہ بڑا محدود رہتا ہے۔ ہندوستان آتے ہی ان کا پہلا واسطہ ملازموں اور نوکروں سے پڑتا ہے' انہیں کے رابطہ سے ہندوستان کے بارے میں ان

کے تاثرات مستحکم ہو جاتے ہیں جو آخر وقت تک رہتے ہیں۔ وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہندوستان میں اچھے و برے دونوں قسم کے لوگ ہیں' ان میں علاقہ کے لحاظ سے بھی فرق ہے' لہٰذا تمام ہندوستانیوں کے بارے میں ایک رائے قائم نہیں کرنی چاہئے۔ (12) لیکن وقت کے ساتھ جان شور کے خیالات میں بھی تبدیلی آتی ہے وہ کہتا ہے کہ :

> ہندوستانیوں کے کردار میں ایک اہم بات جس کو فراموش نہیں کرنا چاہئے یہ ہے کہ وہ بغیر شرم اور جھجک کے جھوٹ بولتے ہیں۔ یہ کم و بیش تمام طبقوں میں ہے خاص طور سے نچلے طبقوں میں تو یہ خصوصیت بڑی گہری ہے۔ (13)

بعد میں آنے والوں کے لئے ہندوستانیوں کے بارے میں ہمدردی کے یہ جذبات بھی نہیں رہے تھے۔ 1786ء میں جیمس گرانٹ نے ان کے بارے میں رائے دیتے ہوئے کہا تھا کہ یہ جاہل' بدتمیز' اور بے ہودہ ہیں۔ یہ اس حد تک بگڑے ہوئے ہیں کہ ان کی اصلاح بھی نہیں کی جا سکتی ہے۔ اسی رائے کا اعادہ کمپنی کی ایک رپورٹ میں کیا گیا کہ نہ ہی ان لوگوں میں مذہبی احساس ہے اور نہ اخلاقی اقدار۔ جب ان کے مادی مفادات آتے ہیں تو یہ ہر اخلاقی قدر کو بھول جاتے ہیں۔ جہاں تک ایمانداری کا تعلق ہے وہ تو ان میں نام تک کو نہیں ہے۔ 1759ء میں ہول ویل (Hol well) نے اہل ہندوستان اور ایمانداری کے بارے میں کہا تھا کہ یہ لوگ اس تصور سے قطعی ناآشنا ہیں۔ (14)

چنانچہ جب اہل ہندوستان کو جاہل' وحشی' غیر متمدن' اور غیر مہذب قرار دے دیا گیا۔ اور ان کے مقابلہ میں انگریز متمدن' مہذب' اور ایماندار ٹھہرے' تو ان دونوں قوموں کے درمیان ایک ایسا فرق پیدا ہو گیا جو دور نہیں ہو سکتا تھا۔ انگریز عہدیدار' اہل ہندوستان کو اپنے تجربات کی روشنی میں دیکھتے تھے۔ جب ان کی زمینوں پر قبضہ کیا جاتا' ٹیکسوں کی وصولی میں ان پر سختی کی جاتی' اور مقدموں میں انہیں الجھایا جاتا تو وہ قانونی موشگافیوں سے بچنے کے لئے مزاحمت کے جو طریقے اختیار کرتے ان میں جھوٹ

بولنا، جھوٹی گواہی دینا، اور مختلف حیلوں و بہانوں سے حکومتی اقدامات سے بچنا شامل ہوتا تھا۔ ان کی ان مزاحمتی تدابیر کو انگریز عہدیدار ان کے کردار کی خرابیاں گردانتے تھے اور اس معیار پر پوری ہندوستانی قوم کو پرکھتے تھے۔

جب ایک مرتبہ انگریزوں میں برتری کا احساس مستحکم ہو گیا تو انہوں نے ہندوستانیوں کو ذلیل و خوار کرنا شروع کر دیا۔ اب ان کے نزدیک ہندوستانیوں کی ہر چیز قابل تضحیک و نفرت تھی۔ ان کی جسمانی ساخت، ان کا لباس، ان کے کھانے، ان کی زبان، ان کی عادات، اور ان کے ادب آداب یہ سب تہذیب سے گرے ہوئے اور وحشیانہ تھے۔ ان کے اس رویہ پر جان شور نے بھی لکھا کہ:

> انگریزوں میں ہندوستانیوں کے احساسات اور جذبات کی کوئی قدر نہیں رہی ہے۔ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ "ہمیں اس کی کیا پرواہ کہ مقامی لوگ کیا سوچتے ہیں؟" بہت سے معاملات میں وہ ایسی حرکتیں کرتے ہیں کہ جو شاید ان کی نظروں میں تو خاص اہمیت نہ رکھتی ہوں، لیکن ان کے ردعمل میں لوگوں میں وہ جذبات پیدا ہوتے ہیں کہ جن سے ہماری عزت و احترام میں فرق پڑتا ہے۔
>
> بہت سے معاملات میں مقامی لوگوں کی طرف ان کا رویہ نہ صرف اخلاق سے گرا ہوتا ہے بلکہ انصاف سے بھی مبرا ہوتا ہے۔ تعجب اس پر ہوتا ہے کہ مقامی لوگ کس قدر صبر سے اس ذلت کو برداشت کرتے ہیں۔ عام طور پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ انگریز معہ جوتوں کے مسجد یا مندر میں گھس جاتے ہیں۔ اگر ملا یا پجاری احتجاج کرتا ہے تو اسے گالیاں دی جاتی ہیں اور کبھی تو مارا پیٹا بھی جاتا ہے.....
>
> اکثر جگھوں پر مچھلیوں کے تالاب ہوتے ہیں کہ جن کی دیکھ بھال برہمن کرتے ہیں اور مچھلیوں کو روز ان کی غذا فراہم کرتے

> ہیں۔ جب کوئی انگریز ادھر سے گزرتا ہے تو وہ تفریح کی خاطر ان مچھلیوں کا شکار کرتا ہے' اگر برہمن احتجاج کرے تو اسے بھی یا تو گالیاں دی جاتی ہیں یا تھپڑ مارے جاتے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ نہ صرف ان کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنا ہے' بلکہ ان کی نجی زندگی میں بھی دخل اندازی ہے۔ (15)

ہندوستانیوں کے بارے میں تضحیک اور حقارت کے رویوں کے ذریعہ انگریز یہاں پر تمام مزاحمتی جذبات کو کچلنا چاہتے تھے۔ وہ ہندوستانیوں کو تہذیبی' ثقافتی طور پر گرا کر اس مرحلہ تک لانا چاہتے تھے کہ جہاں ان میں آزادی نفس' حریت' اعتماد' اور اپنی ذات کا احساس ختم ہو جائے۔ اس لئے اس بات کی کوشش کی گئی کہ ثقافتی طور پر انگریزوں کی برتری کا احساس ہو اور ہندوستانیوں کو اپنی تہذیب سے نفرت' سرسید نے اپنے مضمون "نئی تہذیب" میں اس پر روشنی ڈالی ہے کہ ان کے زمانے میں وہ لوگ کہ جو اپنی تہذیب کو اختیار کئے ہوئے تھے: ان کے بارے میں ہندوستان کا انگریزی معاشرہ کیا کہتا تھا:

> "جب یورپین جنٹلمین مخلع بالطبع ہو کر ہماری قوم کے پرانے فیشن کی تضحیک کرتے ہیں تو کوئی درجہ حقارت کا اٹھا نہیں رکھتے۔ کہتے ہیں کہ ہندوستانی بندر کے موافق ہیں جو چوتڑوں کے بل زمین پر بیٹھتے ہیں۔ بندر کے موافق کھانے میں ہاتھ سان کر ہاتھ سے کھانا کھاتے ہیں۔ کوئی تمیز ان کی معاشرت میں نہیں ہے۔ وحشیوں سے کسی قدر بہتر ان کا لباس ہے'گو قطع اس کے مشابہہ ہے جو جنگلی وحشی نامہذب قومیں اب تک پہنتی ہیں۔
>
> ..... ایک بہت بڑے مجمع میں جس میں بہت سی لیڈیاں اور جنٹلمین شریک تھے ایک نہایت معزز ہندوستانی اپنا قومی لباس پہنے آگیا۔ جس حقارت اور تعجب سے سب نے اس کو دیکھا ہے وہ

کسی طرح قلم سے بیان نہیں ہو سکتا۔ اکثر لوگ کہتے تھے کہ عجائب خانہ میں رکھنے کے لائق ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ ان کی نمائش کا ٹکٹ اگر مقرر کیا جائے تو بہت کچھ حاصل ہو۔ غرض کہ یہی یورپین جنٹلمین جس قدر ہو سکتا ہے ہماری قوم کے پرانے فیشن کی خاک اڑاتے ہیں۔ (16)

سرسید نے انگریزوں کے اس رویہ کی کئی بار اور کئی جگہ شکایت کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانہ میں اہل ہندوستان کے ساتھ ان کے جاہل پن اور وحشی ہونے کی بنا پر کیسا غیر مہذب سلوک ہو رہا تھا۔ انگریز عہدے داروں نے یہ اصول مقرر کئے تھے کہ جب ہندوستانی ان کے آفس میں آئیں تو جوتے اتار کر آئیں' اگر راستہ میں صاحب کو آتے دیکھیں تو سڑک کے ایک طرف کھڑے ہو جائیں اور سر جھکا لیں' اگر کوئی گھوڑے یا پالکی میں سوار ہو تو اتر کر سلام کرے' جو ایسا نہیں کرتا تھا اسے بے عزت کیا جاتا تھا۔ سرسید نے اس سلسلہ میں کئی واقعات لکھے ہیں۔ اپنے ایک مضمون "جوتے کا مقدمہ" میں وہ لکھتے ہیں کہ :

جو لوگ وقت کی مصلحت اور زمانہ کی ضرورت سے بے خبر ہیں اور جن کی نظر میں قومی عزت کوئی شے نہیں ہے اور جن کو قومی ذلت سے کوئی صدمہ نہیں پہنچتا' شاید وہ اس خبر کو سن کر بھی بے خبر رہے ہوں کہ سر اجلاس ایک نوجوان اسسٹنٹ الہ آباد نے ایک ہندوستانی مختار کار کا جوتا اتروا کر اس کے سر پر رکھ دیا اور چند منٹ تک اس کو اسی طرح کھڑا رکھا ..... جوتا پہن کر عدالت کے کسی کمرے میں جانا خلاف آداب ہی قرار پائے تو جوتا پہن کر جانے والا صرف اس سزا کا مستوجب ہو گا جو قانون کے منشا کے مطابق اس شخص کے واسطے مقرر ہے ..... جو شخص ذرا بھی اپنے مطلب کی تائید کے واسطے زیادہ گفتگو کرے تو نازک

> دماغ حاکم اس کے کان پکڑوائے اور اٹھائے' بٹھاوے یا اس کو ڈیم سور کہہ کر سر اجلاس دو لاتیں لگاوے یا راہ چلتے شخص کو اس جرم میں پکڑ کر بید لگوا دے کہ اس نے ہم کو سلام نہیں کیا تھا۔ ایسی سزاؤں کا اپنی طرف سے جاری کرنا جن کے وہ قانوناً مجاز نہیں ہیں۔ انگریزی عدالتوں کی تہذیب اور انصاف میں سراسر بٹہ لگاتا ہے۔ (17)

سر سید انگریزوں کے اسی رویہ کی بابت یہ واقعہ لکھتے ہیں کہ ایک بار ایک اسسٹنٹ مجسٹریٹ نے ایک شخص کو کہ جو ان کو دیکھ کر گھوڑے سے نہیں اترا اور اسے سلام نہیں کیا اسے سخت سست کہتے ہوئے کہا کہ "اگر تم آئندہ سے ہم کو دیکھ کر گھوڑے سے نہ اترو گے تو ہم تم کو سخت سزا دیں گے۔" اس رویہ کی مزید تفصیلات دیتے ہوئے "زبردستی کا سلام" میں سر سید لکھتے ہیں کہ :

> علاوہ اس قصہ کے بسااوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ گو کیسا ہی معزز اور شریف ہندوستانی ہو اور گو وہ بگی یا ٹم ٹم ہی پر کیوں نہ جاتا ہو اور اگر ادنیٰ صاحب بہادر تشریف لے جاتے ہیں اور وہ ہندوستانی صاحب کو سلام کرے تو صاحب ہرگز اس کا سلام نہیں لیتے اور ان کی اس بے پروائی سے صرف یہی ثابت نہیں ہوتا کہ صاحب کی کج اخلاقی اور تند مزاجی تھی' بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی نہایت ذلیل سمجھے جاتے ہیں۔ (18)

سرسید نے اپنے "رسالہ اسباب بغاوت ہند" میں انگریزوں کے رویوں کی نشان دہی کی ہے کہ ابتدائی دور کے انگریز عہدیدار ہندوستانیوں کی عزت کرتے تھے' ان سے سماجی تعلقات رکھتے تھے' "ان کی ہر طرح خاطرداری کرتے تھے' ان کے رنج و راحت میں شریک ہوتے تھے۔" لیکن بعد کے آنے والوں میں تبدیلی آئی اور ان کا رویہ دوستی سے بدمزاجی میں بدل گیا۔ وہ اس رویہ کو بھی 1857ء کے ہنگامہ کی ایک وجہ قرار دیتے

ہیں :

> کیا ہماری گورنمنٹ کو نہیں معلوم ہے کہ بڑے سے بڑا ذی عزت ہندوستانی حکام سے لرزاں اور بے عزتی کے خوف سے ترساں تھا؟ اور کیا یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ ایک اشراف اہل کار صاحب کے سامنے مسل پڑھ رہا ہے اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر باتیں کر رہا ہے کہ صاحب کی بدمزاجی اور سخت کلامی بلکہ دشنام دہی سے دل میں روتا جاتا ہے۔ (19)

ہندوستانیوں کو کم تری کا احساس روزمرہ کے معاملات ہی میں نہیں دلایا گیا بلکہ اس کا جواز تاریخی' جغرافیائی اور سیاسی وجوہات میں بھی تلاش کیا گیا۔ ایک تاریخی وجہ یہ دی گئی کہ چونکہ ہندوستانی ایک طویل عرصہ تک غلامی میں رہے ہیں اس لئے ذہنی طور پر یہ پس ماندہ ہو گئے ہیں۔ لارڈ میکالے کے مطابق دھوکہ بازی کا تعلق جسمانی ساخت سے ہے' اس لئے ہندوستان میں سب سے زیادہ دھوکہ باز بنگالی ہیں۔ اس کے اس نظریے کے پس منظر میں وکٹورین زمانہ کا یہ تصور تھا کہ جسمانی کمزوری نسلی کمزوری کے مترادف ہے۔

برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کو اس معیار پر بھی دیکھا کہ کون لوگ ان کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں اور کون مزاحمت کر رہے ہیں' یا ان کی مزاحمت سے دور رہنا چاہتے ہیں۔ اس لئے جن قوموں' برادریوں یا قبیلوں نے ان کا ساتھ دیا وہ مارشل یا جنگ جو قومیں کہلائیں اور جو ان سے علیحدہ رہے ان کا شمار جرائم پیشہ قوموں یا قبیلوں میں ہوا۔ خاص طور سے خانہ بدوش قبائل جو حکومت کی پہنچ سے دور تھے حکومت ان پر قابو پانا چاہتی تھی اور انہیں اپنے قانون کے دائرے میں لانا چاہتی تھی ان کی مزاحمت کے باعث ان پر پولیس کی نگرانی ہوتی تھی۔

جیسا ہم دیکھ چکے ہیں کہ ابتداء میں انگریز ہندوستانی ثقافت میں رچ بس گئے تھے۔ لیکن جب ان میں فاتح اور حکمراں کے احساسات ابھرے تو اب یہ ضرورت محسوس

ہوئی کہ ان میں اور محکوم لوگوں میں ثقافتی طور پر فرق نظر آئے اور نہ صرف اختلاف کا اظہار ہو بلکہ یہ بھی احساس ہو کہ انگریز کلچر ہندوستانی کلچر سے زیادہ نفیس' اعلیٰ اور برتر ہے۔ مثلاً اس فرق کو اس طرح بھی دیکھا گیا کہ چلم پینا خراب ہے' مگر سگار پینا اچھا اور تہذیب کی علامت ہے۔ ہندوستانی کھانے بدمزہ ہو گئے اور ان کی جگہ یورپی کھانوں کی تعریفیں ہونے لگیں۔ وکٹوریہ دور کے انگریز اپنے جنسی جذبات کا اظہار کھل کر نہیں کرتے تھے۔ اس لئے انہیں ہندوستانیوں میں بڑی جنسی آزادی اور بے باکی نظر آئی جو ان کی اخلاقی پس ماندگی کی دلیل ہو گئی۔

اپنی رہائش گاہوں کو بھی انہوں نے یورپی نمونہ پر بنانا شروع کر دیا۔ ان کا مکان یا بنگلہ وسیع و عریض علاقہ میں پھیلا ہوتا تھا جہاں وہ اپنے خاندان اور ملازمین کے ساتھ رہتے تھے۔ یہ ہندوستانی معاشرہ سے دور ان کی اپنی علیحدہ دنیا تھی۔ ان کی آبادیاں انگلستان کے گاؤں کے ماڈل پر تعمیر ہونے لگیں۔ مکانوں میں یورپی فرنیچر آ گیا۔ ثقافتی سرگرمیوں میں رقص و موسیقی' تھیٹر اور اخبارات نے انہیں ہندوستانی کلچر سے اور دور کر دیا۔

انگریزوں کی زندگی میں اس وقت مزید تبدیلی آئی جب انہوں نے مقامی عورتوں کی بجائے یورپی عورتوں سے شادیاں کرنی شروع کر دیں۔ اب ان کا تعلق دفتر اور گھر میں صرف ہندوستانی ملازموں سے ہوتا تھا۔ (20)

یہ 1830ء کی دہائی کی بات ہے کہ جب مدراس میں رہنے والی ایک انگریز خاتون سے پوچھا گیا کہ اس نے ہندوستان میں کیا دیکھا تو اس کا جواب تھا کہ "ان لوگوں کے بارے میں۔ اوہ کچھ نہیں' خدا کا شکر ہے کہ مجھے کچھ معلوم نہیں' نہ ہی میرے جاننے کی خواہش ہے' میرا خیال ہے کہ جتنا کوئی کم دیکھے اور سنے اتنا ہی بہتر ہے۔" (21)
مالکم ڈارلنگ جو پورے ایک سال لاہور میں رہا' اس دوران میں اس کا تعلیم یافتہ لوگوں میں سے صرف ایک سے تعارف ہوا۔ جی۔ آر۔ ایلزمی (G. R. Elsmie) جس نے اعلیٰ عہدے دار کی حیثیت سے ہندوستان میں چوبیس سال گذارے' اس عرصہ میں

صرف ایک بار اس نے لاہور کی گارڈن پارٹی میں شرکت کی اور یہاں ہندوستانیوں اور اینگلو انڈینز سے ملا۔ جب چرچل ہندوستان آیا تو اس کا واسطہ صرف ملازموں سے رہا۔ (22)

ہندوستانیوں سے اس علیحدگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی زندگی اپنے ہی لوگوں میں محدود ہو کر رہ گئی۔ ان کی زندگی میں روزمرہ کے معمول ایک جیسے ہو کر رہ گئے : ملازمت کرنا' اور باقی وقت کلب یا گھر میں گزارنا ان میں سے جو غیر شادی شدہ ہوتے تھے وہ اپنا زیادہ وقت کھیلوں یا شراب پارٹیوں میں گذارتے تھے' جس نے ان کی زندگی کو غیر دلکش اور بورنگ بنا دیا تھا۔ جو شادی شدہ ہوتے تھے' وہ ایک دوسرے کے خاندانوں سے باہمی ملاقاتوں میں وقت گذارتے تھے۔ بچوں کو سات سال کے بعد تعلیم کے لئے انگلستان بھیج دیا جاتا تھا' تاکہ وہ ہندوستانی لوگوں کی عادتیں نہ سیکھیں اور اس ماحول سے دور رہیں۔ جو انگریز اپنے بچوں کو نہیں بھیج سکتے تھے وہ خود کو کم تر سمجھتے تھے' ان کے بچوں کے لئے ہندوستان ہی میں پہاڑی شہروں میں اسکول کھولے گئے۔ (23)

ابتدائی زمانہ میں انگریز ساحلی شہروں میں رہتے تھے' جن میں سورت' بمبئی' مدراس اور کلکتہ مشہور شہروں میں سے تھے۔ اگرچہ ان شہروں کی گرمی ان کے لئے ناقابل برداشت تھی مگر حالات کے تحت وہ اس کو برداشت کرتے تھے۔ 1830ء کی دہائی میں انہوں نے پہاڑی شہر بنائے جہاں وہ گرمیوں کا موسم گذارنے چلے جاتے تھے۔ اس عمل سے انگریز طبقہ گرمیوں میں ہندوستانی معاشرہ سے کٹ جاتا تھا۔ (24)

ہندوستانیوں پر حکومت کرنے کے لئے ضروری تھا کہ انگریز فاتح کی حیثیت سے اور برتر نسل کی وجہ سے ہندوستانیوں سے ممتاز اور علیحدہ نظر آئیں۔ اس لئے یہ کوشش کی گئی کہ اعلیٰ عہدیدار بدعنوان نہ ہوں' عیاشی میں مبتلا نہ ہوں' بات چیت کرنے اور لباس میں احتیاط کریں تاکہ کوئی انہیں عام لوگوں کی طرح نہ دیکھے۔ اس مقصد کے لئے بیوروکریسی کے لئے تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ اعلیٰ عہدوں

پر ان ہی امیدواروں کا انتخاب ہوتا تھا جو پبلک اسکولوں' اوکسفورڈ' اور کیمبرج کے تعلیم یافتہ ہوتے تھے۔ ہندوستان میں ان کی سرکاری حیثیت کے تعین کے لئے "Warrant of Precedence" نامی ایک کتاب لکھی گئی جس کے تحت مندرجہ ذیل طریقے سے ان کی درجہ بندی کی گئی۔

1_ آئی- سی- ایس افسر 2_ انڈین پولیٹیکل سروس کہ جس کا تعلق سرحدوں' راجاؤں اور نوابوں کے ساتھ تعلقات رکھنا اور معاہدے کرنا ہوتا تھا۔ 3_ انڈین میڈیکل سروس اور پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ۔ 4_ انڈین آرمی عہدیدار۔ 5_ شعبہ تعلیم سے تعلق رکھنے والوں کا مرتبہ سب سے کم تھا۔ آخر میں چرچ کے عہدیدار' تاجر اور دوسرے پیشوں سے تعلق رکھنے والے آتے تھے۔ انگریزی معاشرہ میں اس درجہ بندی سے ادب' آداب' بات چیت' نشست و برخاست' اور کھانے و پینے میں اعلیٰ و ادنیٰ کا فرق رکھا جانے لگا۔ انگریزوں کے لئے یہ ہدایات بھی تھیں کہ پبلک میں اپنا اچھا تاثر قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ نشہ کی حالت میں لوگوں کے سامنے نہ جائیں۔ جھگڑے اور فساد سے پرہیز کریں' اور عام لوگوں سے دور رہیں' ان سے سماجی تعلقات نہ رکھیں۔

برتری کے احساس کو باقی رکھنے کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ انگریزوں کو نوجوان' صحت مند' چاق و چوبند' چست و توانا دکھایا جائے۔ اس تاثر کو قائم رکھنے کے لئے 1901ء تک یورپی آبادی میں صرف 5% آبادی 50 سال سے اوپر ہوتی تھی' ایک انگریز عہدیدار 50 سال کی عمر میں ریٹائر ہو کر انگلستان چلا جاتا تھا۔ اس لئے ایڈمنڈ برک نے کہا تھا کہ : "مقامی لوگوں کے لئے کسی کھچڑی بالوں والے انگریز کو دیکھنا ناممکن ہے۔" (25)

ہندوستانیوں سے تعلقات اور سماجی رویوں میں عورت کا بھی اہم کردار رہا ہے۔ انگریز معاشرہ میں اہل ہندوستان کی طرح عورت خاندان کی عزت تھی۔ اس لئے ضروری تھا کہ اس کا احترام ہو۔ چونکہ ہندوستان میں اعلیٰ طبقہ کی عورتیں پردے میں

رہتی تھیں اور خاندان سے باہر ان کے سماجی تعلقات بہت کم ہوتے تھے۔ اس لئے انگریزوں نے بھی اپنی بیگمات کو ہندوستانیوں سے دور رکھا۔ (26) جب کبھی وہ گھر سے نکلتیں تو ان کے لئے ادب آداب کا پوری طرح خیال رکھنا ضروری ہوتا تھا۔ مثلاً وہ نقلی زیورات نہیں پہنیں گئیں۔ خوشبو کا استعمال نہیں کریں گی' نہ ہی میک اپ کریں گی۔ ہندوستانی انگریز عورتوں سے کیسے بات چیت کریں' اس مقصد کے لئے 1911ء میں ایک کتاب لکھی گئی تھی (English Etiquette for Indian Gentlemen) اس میں ہدایات دی گئی ہیں کہ گفتگو کرتے وقت ناجائز تعلقات' زنا' بچہ کی پیدائش یا اسقاط حمل کے بارے میں کوئی بات نہیں کی جائے۔ (2&) مزید یہ بھی ادب میں شامل تھا کہ دعوت کے موقع پر خاتون خانہ سے کھانے کی تعریف نہ کی جائے کیونکہ اس کا یہ مطلب ہو گا کہ کھانا نوکروں نے نہیں بلکہ مالکن نے خود پکایا ہے۔ (28)

لباس کے سلسلہ میں ضروری تھا کہ انگریز عورت کا جسم نظر نہ آئے۔ ہنری لارنس نے خاص طور سے یہ ہدایات دیں تھیں کہ انگریز عورتیں مکمل لباس پہنیں اور ہندوستانیوں کے سامنے رقص نہ کریں۔ کیونکہ رقص کرنے والی عورتوں کو ہندوستانی ناچنے والیاں سمجھتے ہیں۔ (28) اس بات کی ہمت افزائی نہیں کی جاتی تھی کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں میں شادی بیاہ ہوں۔ اگر کوئی انگریز عورت ہندوستانی سے شادی کر لیتی تھی تو انگریز معاشرہ اسے رد کر دیتا تھا اور وہ ان سے کٹ جاتی تھی۔ عورت کے سلسلہ میں وہ اس حد تک حساس تھے کہ شراب خانوں میں اجازت نہ تھی کہ یورپی ملازم عورتیں ہندوستانیوں کو شراب پیش کریں۔ جنسی تعلقات کے بارے میں اور زیادہ سختی تھی : یورپی طوائفوں پر پابندی تھی کہ ہندوستانیوں سے جنسی تعلقات نہ رکھیں۔ یہاں تک کہ راجاؤں اور نوابوں کو یورپ جانے کی اجازت دینے میں اس لئے تامل ہوتا تھا کہ وہ وہاں جا کر انگریز اور یورپی عورتوں سے جنسی تعلقات قائم کریں گے۔ اس وجہ سے ان کا احترام اور عزت خطرے میں پڑ جائے گی۔ اس سلسلہ میں ہندوستان کا انگریز معاشرہ اس قدر جذباتی تھا کہ ایک مرتبہ جب مشہور ڈانسر ماڈ ایلن (Maud Allen) کا

ہندوستان میں رقص کا پروگرام بنا تو اس ڈر سے کہ ہندوستانی ٹکٹ خرید کر اس رقص کو نہ دیکھ لیں' انگریز مرد و عورتوں نے سخت احتجاج کیا کہ پروگرام نہ ہو کیونکہ اس سے حکومت کا احترام کم ہو گا۔ لیکن یہ رقص ہوا' اور بقول میکلن کے برطانوی راج بھی قائم رہا۔ (29)

انگریزوں کے اس رویہ کی وجہ سے ہندوستانیوں میں دو قسم کے رجحانات پیدا ہوئے۔ ایک تو یہ کہ انگریزوں سے دور رہا جائے اور ان سے سماجی تعلقات نہ رکھے جائیں کیونکہ اس سے ان کی بے عزتی ہوتی ہے۔ دوسرا رجحان یہ تھا کہ انگریزی ثقافت' اور ان کے طور طریق اور رسم و رواج کو اختیار کیا جائے تاکہ ان کی قربت مل جائے۔ مگر انگریزوں نے اس رجحان کو بھی بڑی تحقیر سے دیکھا۔ سرسید نے "نئی تہذیب" میں لکھا ہے کہ جب لوگ ان کی تہذیب اختیار کرتے ہیں تو وہ غضب آلود ہوتے ہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ ہم اس ذلت کی حالت میں رہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

> اکثروں کو ان میں سے جوش آتا ہے کہ یہ غلام ہماری برابری کرنے پر آمادہ ہوا ہے۔ پاجی غلام چاہتا ہے کہ ہم بطور دوستوں کے اس سے مدارات کریں۔ ...... یہ غلام چاہتا ہے کہ ہمارا دوست بنے اور برابر کے دوستوں کی طرح ہم اس سے ملیں۔ (30)

اس کا اظہار وائسرائے کرزن نے ان الفاظ میں کیا تھا کہ "وہ نظارا بڑا مضحکہ خیز ہوتا ہے کہ جب ہندوستانیوں کو چھری کانٹے سے کھانا کھاتا ہوا دیکھتا ہوں۔" (31)

جب ہندوستانیوں میں ایک یورپی تعلیم یافتہ طبقہ وجود میں آگیا کہ جو انگریزی زبان بھی بولتا تھا اور یورپی نظریات و افکار سے بھی بخوبی واقف تھا تو اب اس طبقہ کے لئے یہ کہنا کہ یہ جاہل' اور غیر متمدن ہے' صحیح نہیں رہا' کیوں کہ انہوں نے یورپی ثقافت کو بھی اختیار کر لیا تھا' اس لئے اب فرق اور علیحدگی کے لئے ضروری تھا کہ نسل کے نظریہ کو آگے بڑھایا جائے اور یہ ثابت کیا جائے کہ تعلیم یافتہ اور ثقافتی طور پر یورپی بننے کے باوجود ہندوستانی نسلی طور پر کم تر ہیں۔ اگرچہ ہندوستانیوں کے لئے نگر

(Nigger) کا لفظ 1848ء سے استعمال ہونے لگا تھا' مگر اب یہ زیادہ استعمال ہونے لگا اور ہر ہندوستانی ان کی نظروں میں نگر ہو گیا۔ (32) جب کہ ہر انگریز چاہے اس کا تعلق انگلستان میں کسی خاندان اور علاقہ سے ہو' اس کے لئے یہ اختلافات ہندوستان میں آ کر ختم ہو جاتے تھے اور یہاں ہر انگریز جنٹلمین ہو جاتا تھا۔ (33)

یہ نسلی برتری صرف ہندوستانیوں تک محدود نہیں رہی بلکہ اس میں یوریشین اور اینگلو انڈینز بھی آ گئے۔ ان کو بھی سرکاری تقریبات میں مدعو نہیں کیا جاتا تھا' آگے چل کر ان لوگوں کو بحری و بری فوج میں اعلیٰ عہدے بھی نہیں دیئے جاتے تھے' بلکہ ان کا تقرر کلرک اور معمولی عہدے دار کی حیثیت سے ہوا کرتا تھا۔ (34)

اینگلو انڈینز اور یوریشین کے خلاف اس پالیسی کے حق میں دلیل یہ دی جاتی تھی کہ اہل ہندوستان بھی ان سے نفرت کرتے ہیں' کیونکہ ہندوستان میں دو نسلوں کے ملاپ سے جو اولاد پیدا ہوتی ہے اسے ناپاک سمجھا جاتا ہے اس لئے ان کے لئے ہندوستانی معاشرہ میں کوئی احترام نہیں ہے۔ اس وجہ سے ان لوگوں کو حکومت کے اعلیٰ عہدے دینے سے حکومت کی عزت میں فرق آئے گا۔ اس کے پس منظر میں انگریزوں کی نسلی برتری کا نظریہ بھی کام کر رہا تھا کہ اگر دو نسلوں میں یہ ملاپ جاری رہا تو اس سے ان کا اقتدار کمزور ہو گا' مزید اس ملاپ سے دو ثقافتوں کی ہم آہنگی ہو گی جو ان کی شناخت اور اہمیت کو ختم کر کے ان کی حکومت کو لوگوں کی نظروں سے گرا دے گی۔ یہ نسلی نفرت اس حد تک تھی کہ یوریشین ڈاکٹر کو یہ اجازت نہ تھی کہ وہ ایک انگریز عورت کو معائنہ کرے۔ (35)

یہ نسلی برتری اور تفاخر تھا کہ انگریز خود کو ہندوستانیوں سے ہر حالت میں برتر سمجھتے تھے اور ہندوستانیوں کے بارے میں یہ تاثر تھا کہ یہ حکومت کرنے کے قطعی اہل نہیں ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان پر حکومت کی جائے اور انہیں اطاعت میں رکھا جائے۔ جب 1885ء میں ہندوستانیوں سے سرکاری و سیاسی اداروں میں نمائندگی کا مطالبہ کیا تو اس وقت بھی یہی دلیل دی گئی کہ ہندوستانی اس قابل نہیں کہ حکومت کر

سکیں۔ حکومت کرنے کا حق صرف انگریزوں کو ہے۔ ما لکم ڈارلنگ اس آئی۔ سی۔ ایس افسر کو سخت انقلابی سمجھتا تھا جو یہ رائے رکھتا تھا کہ ہندوستانی اس قابل ہیں کہ وہ ایک دن حکومت کر سکیں گے۔ (36) انگریز یہ ماننے پر تیار ہی نہ تھے' اور یہ اس وجہ سے تھا کہ وہ ہندوستانی ثقافت اور نسل کو کم تر سمجھتے تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ ہندوستانی قوم پرست اور جمہوریت پسند ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ (37)

حوالہ جات

1. Sale, P.: Conquest of Paradise. New York, 1989.

2_ تفصیل کے لئے دیکھئے: ڈاکٹر مبارک علی: آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان' لاہور 1996ء' ص۔ 125' 126

3_ ایضاً": ص۔ 123' 131' اور 144

4. Spear, P.: The Nobobs, London 1980, P. 32

5_ ایضاً": ص۔ 32

6_ ایضاً": ص۔ 27

7. Hutchins, F. G.: The Illusion of Permanence: The British Imperialism in India, Princeton, 1967, P. 29

8_ ایضاً": ص۔ 8

9_ نندی۔ اشیش: The Intimate Enemy آکسفورڈ یونیورسٹی پریس دہلی 1996ء ص۔ 17

10_ اسپیر: ص۔ 31

11_ ایضاً" : ص۔ 38

12. Maclane, R. D. : The Rebel Bureaucrate, Delhi 1983, P. 139_140

13_ ایضاً" : ص۔ 155 اور 156

14_ مارشل : ص۔ 105

15_ میکلن : ص۔ 87

16_ سرسید : مقالات سرسید : جلد سیزدہم۔ لاہور 1963ء' ص۔ 86_585

17_ ایضاً" : ص۔ 83_581

18_ ایضاً" : ص۔ 33_532

19_ سرسید : مقالات سرسید' جلد نہم' لاہور 1962ء' ص۔ 97

20_ اسپیر: ص۔ 34 اور 35

21. Wurgaft, L. : The Imperial Imagination, Wesleyan Uni. 1983, P. 43

22_ بچنز : ص۔ 109

23_ ایضاً" : ص۔ 27

24_ میکلن : ص۔ 54

25_ بچنز : ص۔ 27

26_ بچنز : ص۔ 57

27_ بچنز : ص۔ 57

28_ میکلن : ص۔ 54

29_ بچنز : ص۔ 57

30_ سرسید (جلد سیزدھم ص۔ 87_586

31_ بچنز : ص۔ 10

32_ ایضاً" : ص۔ 112

33. Ballhatchet, K.: Race, Sex and Class Under the Raj

London, 1980, P. 97

34_ ایضاً : ص- 98

35_ ایضاً : ص- 121

36_ میکلن : ص- 49

37_ بچنز : ص- 88

راج اور اصلاحات

ہندوستانیوں کے بارے میں جب یہ رائے قائم ہو گئی کہ وہ کردار اور افعال کے لحاظ سے قابل اعتبار نہیں ہیں اور نہ ہی ان میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ حکومت کے انتظامی کاموں میں شریک ہو کر موثر کردار ادا کر سکتے ہیں' تو اس کے بعد ہندوستانیوں کے بارے میں برطانوی حکومت کے منتظمین اور اہل الرائے کے دو متضاد نظریے پیدا ہوئے۔ ایک تو یہ کہ ہندوستانی تاریخی طور پر نااہل' کاہل' ست' اور بے ایمان ہیں۔ لہٰذا ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور ان پر طاقت و جبر کے ساتھ حکومت کی جائے کہ جس کے یہ عادی ہیں' کیونکہ ماضی میں ان پر ظالم و جابر حکمرانوں نے حکومت کی ہے اور یہ ایسے ہی حکمرانوں کی اطاعت و فرماں برداری کرتے ہیں۔

دوسرا نظریہ یہ تھا کہ اگرچہ ہندوستانی بدعنوان ہیں اور کمزور کردار کے مالک ہیں' مگر ان کو سدھارا جا سکتا ہے۔ ان کے کردار کو بدلا جا سکتا ہے' ان کی عادتوں میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے' اور انہیں کام کے لائق بنایا جا سکتا ہے۔ یہ جبھی ممکن ہے کہ جب ان کی روایات' اقدار' رسومات اور اداروں کی اصلاح کر کے انہیں تبدیل کیا جائے۔

برطانوی منتظمین اس مرحلہ پر دو جماعتوں میں بٹ گئے۔ ان میں سے ایک جماعت وہ تھی کہ جو "مستشرقین" کہلاتی تھی۔ یہ ہندوستان کی تاریخ' ادب' اور آرٹ سے بڑے متاثر تھے جس کی وجہ سے ہندوستان کے ماضی سے ان کا رومانوی تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ ان کی دلیل تھی کہ موجودہ دور کے ہندوستان اور اس کے لوگوں کی حالت دیکھ کر بطور فاتح ان کے بارے میں یہ رائے قائم کرنا کہ ہندوستانی معاشرہ پس ماندہ ہے اور اس

کے لوگ ذہنی طور پر کم مایہ ہیں' یہ درست نہیں ہے۔ جن لوگوں نے ماضی میں شاندار اور متاثر کرنے والا ادب' آرٹ' موسیقی' اور فن تعمیر کے عجائب تخلیق کئے ہوں' ان کی روایات اور اداروں کو یکسر رد کر دینا اور قابل تحقیر سمجھنا درست نہیں ہے۔ ہندوستان کے لوگوں کے ذہن کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے ماضی کو سمجھا جائے' ان کی روایات اور اداروں کی بنیادوں کا مطالعہ کیا جائے' کیونکہ ہندوستانی معاشرہ انہیں پر کھڑا ہے۔ اگر ان کو تبدیل کیا گیا' تو اس صورت میں معاشرہ انتشار اور بے چینی کا شکار ہو جائے گا۔ اس وجہ سے ان روایات اور اداروں کا احترام کرنا چاہئے۔ اس صورت میں ہندوستانی حکومت سے تعاون کریں گے' ورنہ علیحدہ ہو کر اسے کمزور کرنے کی کوشش کریں گے۔

ہندوستانی روایات اور اداروں کی حفاظت کے طور پر یہ دلیل بھی دی گئی کہ ڈچوں نے جاوا میں سماجی ڈھانچہ کو نہیں بدلا اور ان کے معاملات میں کم سے کم دخل دیا۔ انہوں نے معاشی طور پر فوائد حاصل کرنے پر زور دیا اور وہاں سے افیم' تیل اور دوسری اشیاء کو تجارت کے لئے حاصل کیا اور لوگوں کو ان کے سرداروں اور قوانین کے تحت رہنے دیا۔ (1)

ابتدائی دور میں مستشرقین کی اس پالیسی پر عمل ہوا' اور برطانوی حکومت نے ہندوستان کے سماجی ڈھانچہ کو بدلنے کی کوشش نہیں کی۔ خاص طور سے وہ مذہبی معاملات سے دور رہی۔ اسی وجہ سے عیسائی مشنریوں کو تبلیغ کرنے کے لئے آنے کی اجازت نہیں دی۔ ابتدائی دور میں ہندوستانی معاشرے کے سماجی معاملات میں دخل نہ دینے اور دور رہنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت تک ایسٹ انڈیا کمپنی سیاسی طور پر طاقت ور نہیں ہوئی تھی۔ مزید برآں ریاستی اداروں میں سفید فام لوگوں کی کمی تھی جس کی وجہ سے اسے ہندوستانی عہدے داروں پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا جو کہ اپنے نظام میں کسی تبدیلی کے خواہش مند نہیں تھے۔

دوسرے انہیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ انتظامی معاملات میں تبدیلی بغاوت کا

سبب بن سکتی ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے ریوینیو کے نظام کو قدیم حالت میں رہنے دیا اور اس کو قبول کر لیا کہ حکومتی اداروں کو مغل سلطنت کے روایتی انداز میں رکھا جائے۔ اس ابتدائی زمانے میں کمپنی کا اولین مقصد منافع کمانا اور زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھی کرنا تھا' اس وقت تک لوگوں کو مہذب بنانے سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

معاشرتی اور سماجی اصلاحات بھی سیاسی کمزوری اور حالات کے تقاضوں کے تحت نہ کی جا سکیں۔ اس سلسلہ میں مونسٹیوراٹ الفنسٹن (Mounstuart Elphinston) کا کہنا تھا کہ اگر ہم سماجی اور معاشرتی اصلاحات میں کامیاب ہو گئے تو یہی تو ہو گا کہ ہم سو سے ہزار عورتوں کو ستی ہونے سے بچا سکیں گے۔ لیکن اگر ہم ناکام ہوتے ہیں تو جنگ یا بغاوت کی صورت میں 60 ملین کے قریب لوگ جنگ میں مارے جائیں گے۔

ان سیاسی و سماجی وجوہات کے علاوہ یہ جماعت یہ بھی خیال کرتی تھی کہ ہندوستان کی تہذیب مکمل طور پر ارتقاء پذیر ہو چکی ہے' لہٰذا اب اس کی حفاظت کی ضرورت ہے۔ اس میں اصلاح کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس وقت تک برطانوی حکومت کے منتظمین کی اکثریت اس سے متفق تھی کہ حالات کو اسی طرح سے رہنے دیا جائے' ہندوستانی معاشرے کو تبدیل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی جائے' بلکہ اس بات کی کوشش کی جائے کہ رعایا کا اعتماد حاصل ہو اور ان میں حکومت کی مقبولیت ہو۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے جان اسٹوراٹ مل نے کہا تھا کہ ہندوستان میں یورپی اقلیت کی حکومت ہے جس کی کل تعداد 100 ملین ہے۔ یہ حکومت فوج کی طاقت پر قائم ہے' اس فوج میں بھی اکثریت ہندوستانیوں کی ہے۔ اس لئے حکومت کے لئے ضروری ہے کہ وہ مقامی حکمرانوں سے زیادہ انصاف پسند ہو' اگر ایسا نہیں ہوا تو برطانوی حکومت عوام پر سے اپنا اعتماد کھو دے گی۔ (2)

برطانوی حکومت کے رویہ میں اس وقت تبدیلی آئی جب سیاسی طور پر ان کی

حیثیت مضبوط ہو گئی اور انہوں نے اپنے تمام مخالفین کو یا تو شکست دے کر ختم کر دیا' یا ان سے معاہدے کر کے ان پر بالادستی قائم کر لی۔ لہٰذا 1784ء سے لے کر 1828ء تک حکومت کے رویہ میں تبدیلی آتی رہی' اور وہ جماعت مضبوط ہوتی رہی کہ جس کا خیال تھا کہ اگرچہ ہندوستانی اداروں کو باقی تو رکھا جائے' مگر ان میں ارتقائی اصلاح کی جائے۔ سیاسی استحکام نے ان میں فاتح کی ذہنیت کو مضبوط بنایا۔ اب ہندوستان ان کی نو آبادی تھا۔ اس ملک میں ان کا قیام کسی محدود مدت کے لئے نہیں تھا بلکہ اب یہاں انہیں ایک طویل عرصہ تک حکومت کرنی تھی' اور بعض کے خیال میں تو ہمیشہ کے لئے ہندوستان ان کا ہو چکا تھا۔ لہٰذا جب ان میں مستقل حکومت کرنے کا خیال جاگزیں ہو گیا' تو اب یہ ضروری ہو گیا کہ ہندوستانی معاشرے کو اپنی ضروریات کے مطابق ڈھالا جائے۔ اس تبدیلی کا اظہار واضح الفاظ میں اخبار ٹائمز کی 1847ء کی ایک رپورٹ میں ہوتا ہے۔

> وہ دن ختم ہوئے کہ جب ہندوستان سے ہیرے جواہرات' تخت طاؤس اور لعل و یاقوت لوٹے جاتے تھے۔ ہندوستان کا خزانہ اب لوگوں کے اندر ہے۔ ان کی حالت کو بہتر بنایا جائے اور ان کے ذرائع اور توانائی کو استعمال کیا جائے۔ ہندوستان سے قحط ختم کرنا' لوگوں کی جسمانی اور مالی حالت ٹھیک کرنا' اس میں چھپی ہوئی دولت ہے۔ (3)

ہندوستان میں اصلاحات کی اس تحریک کے پس منظر میں انگلستان میں ہونے والی تبدیلیاں تھیں۔ صنعتی انقلاب نے وہاں کے معاشرے کے جمود کو توڑ کر اسے متحرک کر دیا تھا۔ معیشت کے نئے نظریات ابھر رہے تھے۔ صنعتی انقلاب نے بورژوا طبقہ کو جاگیردار کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا تھا۔ اب وہ خواہش مند تھا کہ اسے بھی حکومت چلانے میں شریک کیا جائے اور معاشرے میں اس کے سماجی رتبہ کو تسلیم کیا جائے۔ یہ بورژوا طبقہ اپنی حمایت اور مفادات کے تحفظ کے لئے نئی اخلاقی قدریں لے کر آیا۔ ان اخلاقی

قدروں میں سب سے زیادہ اہمیت کام کی تھی' اب انسان کا سب سے بڑا مذہب اس کا کام ہوا' خدا کی جگہ ملک اور ملک کی خدمت نے لے لی- کام کے لئے ضروری ہوا کہ اسے ایمانداری' اور ڈسپلن کے ساتھ کیا جائے- لہٰذا ان بورژوا اخلاقی قدروں نے لبرل ازم کی تحریک کو پیدا کیا جس کے تحت جب ہندوستان کے حالات کا تجزیہ کیا گیا تو کہا گیا کہ انسانی ذہن ہر جگہ ایک سا ہے' اس لئے اگر وہ انگلستان میں تبدیل ہو سکتا ہے تو اسے ہندوستان میں بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے- تبدیلی کے اس عمل سے نہ صرف ذہن کو تبدیل کیا جائے بلکہ معاشرے کے اداروں اور روایات کو بھی تبدیل کیا جائے- اس مقصد کے لئے ہندوستان کے لوگوں کو مطلق العنان' حکمرانوں' زمینداروں اور پجاریوں سے نجات دلائی جائے تاکہ لوگ توہمات سے آزاد ہوں جس کے نتیجہ میں فرد میں آزادی اور خود انحصاری پیدا ہو گی (4) چونکہ ہندوستان ایک نوآبادی بن چکا تھا' اس لئے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ ہندوستان کی ترقی کے لئے' سماجی و معاشرتی اصلاحات ضروری ہیں اور یہ اصلاحات اس وقت کامیاب ہو سکتی ہیں کہ جب ہندوستان میں انگریز کلچر کو روشناس کرایا جائے اور اس کو ان نئی قدروں کے مطابق ڈھالا جائے- (5)

انیسویں صدی میں ابھرنے والی افادیت پرستی (Utilitarianism) نے بھی ہندوستان میں برطانوی منتظمین اور ان کے رویوں پر اثر ڈالا- افادیت پرستی کے خیالات کے زیر اثر انہوں نے ہندوستان کی روایات اور اداروں کو اس معیار پر پرکھا کہ جدید حالات میں ان کی افادیت کیا ہے؟ کیا یہ معاشرے کی ترقی میں معاون ہو سکتے ہیں' یا یہ اپنی اہمیت اور افادیت کھو چکے ہیں اور اب ان کی حیثیت ایک خشک' کھوکھلے' اور فرسودہ درخت کے تنے کی سی ہے کہ جس میں دوبارہ سے کوئی تازگی' اور زندگی پیدا نہیں کی جا سکتی؟ ان کی دلیل تھی کہ ہندوستانی معاشرے کو ترقی یافتہ اور جدید بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اسے توہمات سے نجات دلائی جائے' ماضی پرستی سے چھٹکارا دلایا جائے' اور سائنسی سوچ کو پیدا کیا جائے کیونکہ موجودہ حالات میں ہندوستانی تہذیب افادیت سے خالی ہے-

تیسری تحریک جس نے انگلستان کے معاشرے کو متاثر کیا وہ ایون جیلیکن (Evangelican) کی مذہبی تحریک تھی کہ جو فرانسیسی انقلاب کے نتیجہ میں اٹھارویں و انیسویں صدی میں مقبول ہوئی- اس نے عوام میں انقلابی نظریات کو روکنے کی غرض سے مذہبی عقائد کو اس طرح سے پیش کیا کہ اس سے نچلے طبقوں کے لوگ متاثر ہوئے- ان کا اہم نقطہ نظریہ تھا کہ فرد کو معاشرے کے لئے مفید ہونا چاہئے-

انگلستان میں ہونے والی ان تبدیلیوں اور تحریکوں کا اثر ہندوستان پر بھی ہوا- ہندوستان میں سماجی اور معاشرتی اصلاحات کے سب سے بڑے حامی ولیم بینٹک (1838ء_1828ء) میکالے اور مٹکاف تھے- یہ ہندوستان کی روایات و اقدار کو نظر انداز کر کے' معاشرہ کو یورپی ماڈل پر تشکیل کرنا چاہتے تھے- اس مقصد کے لئے یہ ضروری سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے متوسط طبقے کی حمایت حاصل کی جائے اور ان کو اصلاحات کا ذریعہ بنایا جائے- اصلاحات صرف سماجی اور معاشرتی ہی نہ ہوں' بلکہ تکنالوجیکل ایجادات سے بھی اہل ہندوستان کو روشناس کرایا جائے-

ان کا نقطہ نظر یہ بھی تھا کہ اصلاحات کے عمل کو جاری رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ جنگ سے پرہیز کیا جائے' کیونکہ جنگ بہت مہنگی ہوتی ہے' لہٰذا اس پیسہ کو اصلاحات کے نفاذ میں خرچ کیا جائے- جنگ سے پرہیز کی اس پالیسی کو برطانوی فوج کے افسروں نے پسند نہیں کیا' کیونکہ جنگ نہ ہونے سے ایک تو ان کے الاؤنس بند ہو جاتے تھے اور دوسرے ان کی اہمیت کم ہو جاتی تھی اور سول انتظامیہ کے عہدیداروں کی اہمیت بڑھ جاتی تھی- اگرچہ حالات نے ثابت کیا کہ جنگ کے خاتمہ نے حکومت کے مالی حالات کو بہتر بنایا اور اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ معاشرے میں اصلاحات کو روشناس کرایا جا سکے- لیکن جب 1838ء میں افغان جنگ ہوئی تو اس کی وجہ سے اصلاحات کا پورا عمل رک گیا اور وہ پیسہ جو ان پر خرچ ہو رہا تھا' وہ جنگ کی تیاریوں میں لگ گیا- (6)

ہندوستانیوں کو مہذب بنانے کے لئے جو منصوبے بنائے گئے' ان میں سے ایک تو

یہ تھا کہ انہیں عیسائی بنا لیا جائے تاکہ عوام اور حکومت کے درمیان مذہبی فرق ختم ہو جائے۔ ابتدائی دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس پالیسی کو اختیار کیا تھا کہ ہندوستان کے لوگوں کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی نہیں کی جائے کیونکہ مذہبی معاملات میں دخل اندازی بغاوت' شورش اور بدامنی کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ ان کا یہ نظریہ اس بنیاد پر تھا کہ لوگ سیاسی بالا دستی کو تو قبول کریں گے' مگر اپنے مذہبی عقائد کو تبدیل نہیں کریں گے۔ چونکہ اس دور میں کمپنی کے مقاصد میں صرف تجارتی اور معاشی فوائد کا حصول ہی شامل تھا' اس لئے انہوں نے سماجی و مذہبی معاملات سے خود کو دور رکھا۔ مذہبی معاملات میں دخل دینے کا جذبہ ایک تو ان مذہبی تحریکوں میں تھا کہ جو انگلستان میں سرگرم عمل تھیں۔ میتھوڈسٹ اور ایون جیلیکن مشنری انگلستان میں کامیابی کے بعد اب ہندوستان کو اپنی کارروائیوں کا مرکز بنانا چاہتے تھے۔ اور یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کو عیسائی بنا کر ان کی اخلاقی حالت کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ چارلس گرانٹ ہندوستانیوں کے لئے عیسائی مذہب کو تمام مسائل کا حل سمجھتا تھا کہ اس کے ذریعے ہندو مذہب کی خرابیاں مثلاً ذات پات' بت پرستی' برہمنوں کی بالادستی اور توہمات دور ہوں گے۔ ان کی اخلاقی حالت بہتر ہو گی اور ان کی غربت و سستی جو ان کے گناہوں کی وجہ سے ہے وہ دور ہو جائے گی۔ (7)

عیسائیت کی تبلیغ کے سلسلہ میں ایک دلیل یہ بھی تھی کہ اگر ہندوستانی عیسائی ہو جاتے ہیں تو اس صورت میں انقلاب کے راستے بند ہو جائیں گے اور عوام حکومت سے ایسے ہی وفادار ہو جائیں گے جیسے کہ انگلستان میں ہوئے۔ اس سوال کے جواب میں کہ اگر عیسائیت کے نتیجہ میں ہندوستانیوں نے سیلف رول مانگا تو کیا کریں گے؟ اس پر چارلس گرانٹ کا کہنا تھا کہ "عیسائیت حکومت تبدیل کرنے پر زور نہیں دیتی ہے۔ یہ اخلاقی بہتری چاہتی ہے لہٰذا اس کے نتیجہ میں سیاسی مطالبات نہیں ابھریں گے۔ یہ اخلاقی نقطہ نظر سے سیاست کو خطرے میں نہیں ڈالتی ہے۔" (8)

اس دباؤ کے نتیجہ میں 1813ء میں کمپنی نے عیسائی مشنریوں کو ہندوستان آنے کی

اجازت دے دی۔ جہاں اس اجازت کے پس منظر میں عیسائی مشنریوں کا مذہبی جوش و جذبہ تھا' وہاں کمپنی اس کو اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے بھی ضروری خیال کر رہی تھی۔ اگر ہندوستانی عیسائی ہو جاتے ہیں تو اس سے مذہبی اور ثقافتی دوری ختم ہو جائے گی اور عوام ان کی حکومت کو اپنی حکومت تسلیم کر کے اس کے وفادار ہو جائیں گے۔ کیونکہ جب تک مذہبی اور ثقافتی فرق قائم ہے دونوں فرقے ایک دوسرے کے قریب نہیں آئیں گے۔ اس کا اظہار دوباؤ نے اس طرح سے کیا ہے کہ ایک برہمن ہندو کس طرح سے ایک یورپی کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھ سکتا ہے جب کہ وہ دیکھتا ہے کہ وہ گائے' جو اس کے لئے مقدس ہے' وہ اس کا گوشت کھا رہا ہے۔ چارلس گرانٹ کا بھی کہنا تھا کہ جب تک ہندوستانی اپنے مذہب پر رہیں گے وہ اپنے انگریز حکمرانوں سے محبت نہیں کر سکتے ہیں۔ (9)

چنانچہ مذہبی تبلیغ کا جو سلسلہ شروع ہوا' اس میں برطانوی حکام بھی پورے پورے شریک تھے۔ اس صورت حال کا تجزیہ سرسید احمد خان نے اپنے مشہور مقالہ "رسالہ اسباب بغاوت ہند" میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> "بعضے صاحب اپنے ملازموں کو حکم دیتے تھے کہ ہماری کوٹھی پر آن کر پادری صاحب کا وعظ سنو اور ایسا ہی ہوتا تھا۔ غرض کے اس بات نے ایسی ترقی پکڑی تھی کہ کوئی شخص نہیں جانتا تھا کہ گورنمنٹ کی عمل داری میں ہمارا یا ہماری اولاد کا مذہب قائم رہے گا۔" (10)

سرسید نے مزید اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ پادری صاحبان نے جو مذہبی کتابیں برائے تبلیغ چھاپنی شروع کیں ان میں دوسرے مذاہب پر اعتراضات شروع کر دیئے اور ان کے پیغمبروں اور مقدس لوگوں کو بارے میں تضحیک آمیز الفاظ لکھے گئے جن سے لوگوں کو رنج ہوا۔ (11) مشنریوں کی پالیسی یہ تھی کہ عیسائیت کی سچائی کو ثابت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہندومت اور اسلام کو مکمل طور پر رد کیا جائے اور یہ

ثابت کیا جائے کہ یہ مذاہب گمراہ کن ہیں۔ اس مقصد کے لئے مشنریوں نے نہ صرف کتابیں اور پمفلٹ لکھے بلکہ میلوں اور بازاروں میں جا کر عیسائیت کے حق میں وعظ کرنا شروع کر دیئے۔

> پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل مقدس ہی کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ غیر مذہب کے مقدس لوگوں کو اور مقدس مقاموں کو بہت برائی اور ہتک سے یاد کرتے تھے۔ (12)

عیسائیت کے بارے میں لوگوں کو اس وقت سخت پریشانی ہوئی کہ جب 1855ء میں پادری ایڈمنڈ نے سرکاری ملازمین کے پاس اس قسم کے خطوط روانہ کئے کہ جن کا مطلب تھا کہ:

> اب تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہو گئی تار برق سے سب جگہ کی خبر ایک ہو گئی' ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمدورفت ایک ہو گئی' مذہب بھی ایک چاہئے' اس لئے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ۔ (13)

عیسائی مذہب کی تبلیغ کے نتیجہ میں مسلمان اور ہندو دونوں مذاہب کے عالم میدان میں نکل آئے جس کی وجہ سے مناظرہ کا کلچر پیدا ہوا۔ اب جگہ جگہ ان مذاہب کے علماء کے درمیان مناظرے ہونے لگے جن میں ہر مذہب والا اپنے مذہب کی سچائی اور حقانیت کا پرچار کرنے لگا۔ ان مناظروں نے ہندوستان میں ایک ایسی مذہبی شناخت کو پیدا کیا کہ جو اس سے پہلے نہیں تھی۔ ان میں نہ صرف مذہب کے عقائد پر اعتراض ہوتے تھے' بلکہ مذہبی راہنماؤں پر بھی تنقید کی جاتی تھی جس سے لوگوں میں ایک دوسرے کے خلاف مذہبی نفرتیں پیدا ہوئیں۔

ان مناظروں میں ایک شخص بہت مشہور ہوا۔ اس کا نام کارل گوٹ لیب پفانڈر تھا' یہ تبلیغ کی غرض سے 1839ء میں ہندوستان آیا۔ اس سے پہلے یہ عراق' ایران' اور ترکی میں رہ چکا تھا۔ اس کے نقطہ نظر سے نوآبادیاتی نظام نے اسلامی ممالک کو شکست

دے کر اس قدر پس ماندہ بنا دیا تھا کہ اب اس میں کوئی توانائی نہیں رہی تھی اس لئے اگر اسلامی معاشرے میں عیسائیت کی تبلیغ کی جائے تو وہ ذہنی طور پر مذہب تبدیل کرنے کے لئے تیار تھے۔ وہ اس کا بھی قائل تھا کہ یورپ کی ٹکنالوجیکل ترقی اسلامی معاشرے کو شکست دے دے گی۔ اور اسلام اپنا اثر و رسوخ کھو کر ختم ہو جائے گا۔ چھاپہ خانہ کی ایجاد اور اس کے استعمال سے عیسائی مذہب کی تبلیغ میں سہولت ہو گی۔ مشنری اسکولوں کے ذریعہ ان کو عیسائی مذہب کی تعلیم دی جا سکے گی اور اس کے ذریعہ نئی تعلیم یافتہ نسل میں ان کے مذہب کے بارے میں فکر و شبہات کو پیدا کیا جائے گا تاکہ وہ اپنے عقائد چھوڑ کر عیسائی بننے پر تیار ہو جائیں۔ مسلمانوں پر یہ بھی واضح کیا جائے گا کہ ان کی سیاسی و معاشی ترقی کا انحصار اس پر ہے کہ وہ عیسائی ہو کر مغرب کی ترقی میں خود کو شامل کر لیں' کیونکہ دوسری صورت میں ان کے لئے سوائے تباہی کے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ (14) اگرچہ پفانڈر بڑے عزائم کے ساتھ آیا تھا مگر مسلمان علماء کی جانب سے سخت مقابلہ کا سامنا کرنا پڑا جس کے نتیجہ میں وہ مایوس ہو کر ہندوستان سے چلا گیا۔

ان مناظروں کی وجہ سے اور تبدیلی مذہب کے ڈر سے ہندوستان میں ایک طرف علماء کا اثر و رسوخ بڑھا تو دوسری طرف برہمنوں نے اپنی بالادستی کو قائم کیا اور زندگی کے معاملات کو سیاسی و اقتصادی سے زیادہ مذہبی نقطہ نظر سے دیکھا جانے لگا۔

اصلاح کی دوسری کوشش تعلیم کے شعبہ میں ہوئی۔ چنانچہ میکالے نے جو 1835ء میں اپنی رپورٹ پیش کی اس میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ برطانوی حکومت کو ہندوستان میں ایک ایسے تعلیم یافتہ طبقے کی ضرورت ہے کہ جو ذہنی طور پر تو یورپی ہو مگر شکل و صورت میں ہندوستانی۔ انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنا کر اور اسے سرکاری زبان کی حیثیت دے کر' برطانوی حکومت نے ہندوستان کی ثقافت پر گہری ضرب لگائی۔ چنانچہ وہ پرانی نسل جو روایتی تعلیم یافتہ تھی' اس کی بالادستی ختم ہو گئی اور وہ معاشرے کے بیشتر افراد بیکار اور نااہل ہو گئے۔ ان کی جگہ جو نئی یورپی تعلیم یافتہ نسل آئی' اس کا نقطہ نظر

اب روایت کی بجائے جدیدیت پر مبنی تھا۔ تعلیم کے ذریعہ برطانوی حکومت نے نہ صرف اپنے معاون پیدا کئے بلکہ اس کے ذریعہ سے انفارمیشن پر بھی اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ نئے نصاب میں خاص طور سے "انگریزی ادب" کا اضافہ ہوا۔ اس وقت انگلستان کے تعلیمی اداروں میں بھی انگریزی ادب نہیں پڑھایا جاتا تھا' ہندوستان میں اس کی اس لئے ضرورت تھی تاکہ اس کے ذریعہ سیکولر اور انگریزی کلچر کو فروغ ملے اور تعلیم یافتہ نسل کو ذہنی طور پر یورپی ثقافت میں ضم کیا جائے۔

اگرچہ اس خدشہ کا اظہار کیا گیا کہ یورپی تعلیم یافتہ نسل آگے چل کر سیاسی مطالبات کے لئے آواز اٹھائے گی۔ کیونکہ ایک مرتبہ جب وہ جدید یورپی افکار سے روشناس ہوں گے تو ان میں سیاسی شعور بھی آئے گا اور وہ اس قابل بھی ہوں گے کہ حکومت کا مقابلہ کریں۔ میکالے نے 1833ء میں اس موضوع پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

> یورپی تعلیم حاصل کرنے کے بعد' وہ مستقبل میں کسی مرحلہ پر یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ انہیں بھی یورپی طرز کے اداروں کی ضرورت ہے۔ کیا اس قسم کا دن بھی کبھی آئے گا' اس کے بارے میں تو مجھے کچھ معلوم نہیں۔ لیکن اس کی وجہ سے میں نہ اپنے موقف سے ہٹوں گا اور نہ اسے رد کروں گا۔ لیکن اگر کبھی وہ دن آتا ہے' تو وہ دن یقیناً انگلستان کی تاریخ کا سب سے زیادہ قابل فخر دن ہو گا۔ (16)

جب حکومت کی جانب سے سماجی و معاشرتی اصلاحات ہوئیں تو اس نے ہندوستان کے سماج میں ایک انتشار پیدا کر دیا کیونکہ ان اصلاحات کی وجہ سے ایک طرف تو مذہبی راہنماؤں' رسوم و رواج' اور کمیونٹی و برادری کے اختیارات کو چیلنج کیا گیا' دوسری طرف ان تبدیلیوں نے معاشرے کے جمود کو توڑا' اور اس بات کی ضرورت ہوئی کہ نئے حالات میں نئے طریقوں سے سمجھوتے کئے جائیں۔ مثلاً ستی کے خاتمہ نے ہندو

معاشرے کو تبدیل ہونے پر مجبور کیا کہ ان کے ہاں اب تک عورت کی جو پوزیشن تھی' اب وہ اس کو تبدیل کریں' سرسید نے اسباب بغاوت ہند میں ان چند اصلاحات کا ذکر کیا ہے کہ جن سے ہندوستانی معاشرے میں ہلچل مچ گئی۔ مثلاً ایکٹ 15' 1856ء کے ذریعہ بیوہ عورتوں کو شادی کی اجازت دی گئی' اس پر سرسید لکھتے ہیں کہ :

> مگر ہندو لوگ جو مذہب سے زیادہ پابند رسم و رواج کے ہیں اس ایکٹ کو نہایت ناپسند کرتے تھے۔ بلکہ باعث اپنی ہتھک عزت اور بربادی خاندان کا جانتے تھے اور یوں بدگمانی کرتے تھے کہ یہ ایکٹ اس مراد سے جاری ہوا ہے کہ ہندو بیوائیں خود مختار ہو جائیں اور جو چاہیں سو کرنے لگیں۔ (17)

انتظامی معاملات اور ریوینیو میں جو اصلاحات ہوئیں اس نے بھی متعلقہ طبقوں کو متاثر کیا۔ مثلاً جاگیروں کی ضبطی' ریوینیو ادا نہ کرنے کی صورت میں جاگیروں کا نیلام' اودھ میں تعلقداری کے نظام کو ختم کر کے زمین کسانوں کو دینا' عدالتوں کا قیام نئے قانون وغیرہ۔ ان اصلاحات سے جو تبدیلیاں آئیں اس کے لئے لوگ ذہنی طور پر تیار نہیں تھے۔ ہندوستانی معاشرہ سماجی روایات اور رسم و رواج میں کسی تبدیلی کا خواہش مند نہیں تھا' جس طرح سے اس نے مذہب میں حکومت کی دخل اندازی کو قبول نہیں کیا' اسی طرح اس نے اپنے رسم و رواج میں اصلاح کو تنقیدی نظر سے دیکھا اور حکومت کی جانب سے قانون سازی کو قبول نہیں کیا۔ چونکہ ان اصلاحات سے طبقہ اعلیٰ کے لوگ اور ان کے مفادات متاثر ہوتے تھے اس لئے سب سے زیادہ سراسیمگی اور پریشانی انہیں لوگوں میں تھی۔

ان اصلاحات نے صورت حال کو اس وقت اور بگاڑا جب اصلاح پسندوں کی جانب سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ ہندوستانی ریاستوں کا برطانوی حکومت سے الحاق کر لیا جائے تاکہ ان کے خراب حالات کو درست کیا جا سکے۔ ان خیالات کا اظہار جیمس مل نے کیا۔ جب برطانوی حکومت نے ہندوستانی ریاستوں میں اپنے ریذیڈنٹ مقرر کئے اور ان کے

حکمرانوں کو اندرونی معاملات میں کھلی چھٹی دیدی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکمران بیرونی خطرات سے آزاد ہو کر عیاش' کاہل اور نکمے ہو گئے۔ اس سے برطانوی حکومت کو یہ موقع ملا کہ جب کسی ریاست کے حالات خراب ہوتے تو وہ اسے اندرونی بدنظمی کہہ کر اس پر قبضہ کر لیتے تھے۔ اس کی وجہ سے ریاستوں کے حکمران بالکل اس کے رحم و کرم پر تھے اور برطانوی حکومت کی خوشنودی ان کا اولین مقصد تھی۔

اصلاح کی اس پوری تحریک سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ برطانوی حکومت اور اس کے منتظمین نے ان اصلاحات کو قانونی طور پر اوپر سے زبردستی نافذ کیا اور ان کے لئے معاشرے اور لوگوں کو ذہنی طور پر مکمل طریقے سے تیار نہیں کیا۔ اگرچہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں سماجی اصلاح کی تحریکیں ضرور تھیں' مگر ان میں اور حکومت میں کسی قسم کا تعاون نہیں تھا۔

ان اصلاحات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان کے پس منظر میں برطانوی حکومت اور برطانوی سامراج کے اپنے عزائم و مقاصد تھے نہ کہ ہندوستانی معاشرے اور لوگوں کی فلاح و بہبود۔ کیونکہ ان کا اولین مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے لوگوں کو رسم و رواج کی قید سے آزاد کیا جائے' ان طبقوں اور جماعتوں کو کام کے قابل بنایا جائے جو کہ جاگیروں اور لوگوں کے چندوں پر پل رہے تھے' تاکہ معاشرے سے یہ بوجھ ختم ہو اور ملک میں معاشی و اقتصادی ترقی ہو۔ جیسا کہ ٹائمز اخبار نے لکھا تھا' اب لوگوں کی توانائی کی ضرورت تھی تاکہ اس کو حکومت کے استحکام اور معاشی مفادات کے لئے استعمال کیا جائے۔ اسی وجہ سے نئی تعلیمی پالیسی کا نفاذ ہوا' اور اس نے سماجی اصلاحات کا نفاذ کیا۔ اگرچہ نظر تو ایسا آتا ہے کہ یہ اصلاحات زیادہ کامیاب نہیں رہیں' مگر اس نے معاشرہ میں جو حرکت پیدا کی' اور جمود کو توڑا' اس سے عمل رکا نہیں بلکہ برابر آگے بڑھتا رہا۔ لیکن 1857ء کی بغاوت نے برطانوی حکومت کی سوچ کو ضرور بدل دیا۔

حوالہ جات

1. Stokes, E. : The English Utilitarians and India, Oxford, 1959, P. 27

2. Bearce, P. 292

3_ ایضاً: ص- 220

4_ مٹکاف: ص- 29

5_ ایضاً: ص- 34

6. Bearce, P. 165

7. Hutchins, PP. 12_16

8_ ایضاً: ص 14_13

9_ ایضاً: ص- 157_154

10_ سر سید- (نہم) ص- 68

11_ ایضاً: ص- 68

12_ ایضاً: ص- 69

13_ ایضاً: ص- 73

14. Powell, A. A. : Muslims and Missionaries in Pre Mutiny India.

London 1993, P. 154_156

15_ مٹکاف- ص 41_40

16_ ایضاً: ص- 34

17_ سر سید: ص- 76

علیحدگی اور تسلط

1857ء کی جنگ آزادی یا بغاوت نے اصلاحات کے اس عمل کو روک دیا۔ جب جنگ کا خاتمہ ہوا' تو برطانوی حکومت کی جانب سے اس کا تجزیہ کیا گیا کہ یہ حادثہ کیوں ہوا؟ اس کی کیا وجوہات تھیں؟ اور آئندہ کے لئے اس قسم کے حادثات کو کیسے روکا جائے؟ اس سلسلہ میں ایک نقطہ نظر تو یہ تھا کہ یہ سارا ہنگامہ اس لئے ہوا کیونکہ اصلاحات نے ہندوستان کے معاشرے کے توازن کو بگاڑ دیا۔ وہ تمام طبقے' جماعتیں' اور افراد حکومت کے خلاف ہو گئے کہ جن کے مفادات کو اصلاحات نے نقصان پہنچایا۔ ریاستوں کے حکمران اس لئے ناراض ہوئے کہ ان کے اختیارات کو کم کر دیا گیا یا ان کی ریاستوں پر قبضہ کر لیا گیا۔ جاگیردار ار زمیندار اس لئے کہ نئے مالگذاری کے نظام نے ان کی آمدنی اور مراعات ختم کر دیں۔ قدامت پرست ہندو اور مسلمان اس لئے کہ ان کے مذہبی عقائد اور رسم و رواج میں دخل اندازی کی گئی۔ نیا تعلیم یافتہ طبقہ اس لئے کہ انہیں اعلیٰ عہدوں و ملازمتوں سے محروم رکھا گیا۔ اس تجزیہ کے حامیوں نے اس سے اتفاق کیا کہ اصلاحات کے سلسلہ میں مستشرقین کی رائے درست تھی کہ ہندوستان کے معاملات میں دخل نہیں دیا جائے اور ان کی روایات و اداروں کو ان کی حالت پر برقرار رکھا جائے۔

اس کے برعکس ایک دوسرا نظریہ یہ تھا کہ بغاوت کی وجہ عوامی ناراضگی یا بے چینی نہیں تھی۔ اصلاحات نے معاشرے کے توازن کو نہیں بگاڑا اور نہ اصلاحات کی وجہ سے لوگوں میں عدم اعتماد پیدا ہوا۔ انہوں نے بغاوت کا جائزہ لیتے ہوئے دلیل دی کہ یہ بغاوت خاص طور سے شمالی ہندوستان تک محدود رہی۔اور برطانوی حکومت کے

دوسرے علاقے اس سے محفوظ رہے۔ بنگال کا تعلیم یافتہ طبقہ اس میں شریک نہیں ہوا' کیونکہ انہوں نے سب سے زیادہ اصلاحات سے فائدہ اٹھایا۔ اس دلیل کی بنا پر اصلاحات بغاوت کی وجہ نہیں تھیں' بلکہ اس کے پس منظر میں اور دوسرے عوامل بھی کام کر رہے تھے۔ سرسید نے رسالہ اسباب بغاوت ہند میں جن وجوہات کا جائزہ لیا ہے' ان میں بڑی حد تک صداقت ہے۔

1857ء کی جنگ برطانوی حکومت اور اس کے منتظمین کی سوچ میں بڑی تبدیلی لے آئی۔ اس کے بعد سے انہوں نے سماجی و معاشرتی اصلاحات کا پروگرام ترک کر دیا۔ اب جو نئی پالیسی بنائی گئی اس میں عیسائی مشنریوں کی حمایت ترک کر دی گئی کیونکہ اس سے حکومت کا سیکولر کردار متاثر ہوتا تھا۔ دوسری جانب اس کو تسلیم کر لیا گیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی سماجی اور اخلاقی قدروں کی اصلاح کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر یہ دونوں مذاہب والے وقت اور زمانے کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اصلاح کی ضرورت سمجھیں تو خود اس پر عمل کریں۔ ان پر اوپر سے اصلاحات تھوپنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

لہٰذا اب برطانوی حکومت نے سماجی و معاشرتی اصلاحات کی بجائے انتظامی اصلاحات کی طرف توجہ دی کہ عوام کو ٹرانسپورٹ' صفائی' تعلیم اور دوسری سہولتیں دی جائیں تاکہ حکومت کے بارے میں ان کے اچھے تاثرات پیدا ہوں اور وہ حکومت کے احسان مند ہوں۔ (1) اب نئی تبدیلی نے روشن خیالی کی جگہ قدامت پرستی کو دے دی۔

1857ء کے واقعہ نے برطانوی حکومت کو ایک زبردست صدمہ سے دوچار کیا' کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اصلاحات کے ذریعہ وہ ہندوستانی معاشرے کو جدید بنانے اور ترقی دینے میں مصروف ہیں' اس لئے وہ یہ توقع کرتے تھے کہ اہل ہندوستان کو ان کا احسان مند ہونا چاہیئے۔ مگر اس کے بجائے جب انہیں بغاوت کا سامنا کرنا پڑا تو ہندوستانی ان کے لئے احسان فراموش کی شکل میں ابھرے۔ اس نے ان کے خیالات و نظریات اور ان کے رویوں کو بدل کر رکھ دیا۔ اس کے بعد سے علیحدگی کا ایک تصور پیدا ہوا کہ

ہندوستانیوں سے دور رہا جائے' ان سے کم سے کم تعلق رکھا جائے' اور ایک فاصلہ رکھ کے ان پر حکومت کی جائے۔

جب حکمراں اور رعایا میں یہ فاصلہ قائم ہو گیا اور حکمراں عوام سے کٹ گئے تو ریاست اور لوگوں کے درمیان خلیج حائل ہو گئی۔ اب ریاست اور حکمراں طبقوں میں عوام سے نفرت بھی تھی اور ڈر اور خوف بھی۔ اسی پس منظر میں 1857ء کے بعد برطانوی حکومت نے اپنی پالیسیوں کی تشکیل کی۔

1857ء کے بعد ہندوستان میں برطانوی حکومت نے اپنے استحکام کے لئے نئی بنیادوں کو تلاش کیا۔ اس کے نتیجہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاتمہ ہوا' اور مغل بادشاہت کی جگہ تاج برطانیہ نے لے لی۔ اس کے بعد سے یہ کوشش ہوئی کہ ہندوستانی رعایا کی وفاداری تاج برطانیہ سے منسلک کر دی جائے۔ کیونکہ اس سے پہلے مغل بادشاہ' چاہے برائے نام ہی سہی' مگر اقتدار اعلیٰ کی علامت تھا کمپنی اس کے ماتحت تھی اور اس کے نام پر حکومت کرتی تھی۔ اب ہندوستان براہ راست برطانوی بادشاہت کے ماتحت ہو گیا۔ ملکہ وکٹوریہ کو "ایمپرس آف انڈیا" کا خطاب دیا گیا' اور اہل ہندوستان کو یقین دلایا گیا کہ ملکہ کو ہندوستان سے بے انتہا لگاؤ اور محبت ہے اور وہ اس ملک کی فلاح و بہبود چاہتی ہیں۔ لہٰذا ہندوستانیوں کو بھی اس کا وفادار رہنا چاہئے۔

1857ء کے بعد ملکہ نے ہندوستانیوں کے لئے جو معافی نامہ جاری کیا تھا' اس کی حکومت کی جانب سے خوب پبلسٹی کی گئی۔ سرسید نے اس اشتہار کے بارے میں لکھا کہ:

> خداوند ہمیشہ ہماری ملکہ وکٹوریہ کا حافظ ہے۔ میں بیان نہیں کر سکتا خوبی اس پر رحم اشتہار کی جو ہماری ملکہ معظمہ نے جاری کیا۔ بے شک ہماری ملکہ معظمہ کے سر پر خدا کا ہاتھ ہے۔ بے شک یہ رحم اشتہار الہام سے جاری ہوا ہے۔ (2)

ملکہ کی مقبولیت کو بڑھانے کے لئے 1887ء میں گولڈن جوبلی کے موقع پر پورے

ہندوستان میں خوشی منائی گئی اور پھر 1898ء میں ڈا یمنڈ جوبلی کے موقع پر زور شور سے جشن منایا گیا۔ یہ اس بات کی توثیق تھی کہ اہل ہندوستان جو ہمیشہ سے حکمرانوں کی وفاداری کرتے آئے ہیں، مغل بادشاہت کے خاتمہ کے بعد جو خلا ہو گیا تھا، اسے دور کر کے ان کو تاج برطانیہ سے وفادار بنایا جائے۔

بادشاہت کے ادارے کی شان و شوکت کے لئے ضروری ہے کہ اس کا اظہار مختلف مواقع پر عوام میں ہو۔ چنانچہ 1857ء کی بغاوت کی وجوہات بتاتے ہوئے سر سید نے لکھا تھا کہ:

> اہل ہند کی قدیم عادت تھی کہ اپنے بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہوتے تھے۔ بادشاہ کی شان و شوکت اور تجمل اور تحشم دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ ایک قاعدہ جبلت انسانی میں بڑا ہے کہ اپنے بادشاہ اور مالک سے مل کر دل خوش ہوتا ہے، یہ بات جانتا ہے کہ یہ ہمارا بادشاہ اور ہمارا مالک ہے۔ ہم اس کے تابع اور رعیت ہیں، علی الخصوص اہل ہند کو قدیم سے اس کی عادت پڑی ہوئی تھی۔ (3)

چنانچہ اب برطانوی حکومت نے دربار کی اس روایت کا احیاء کیا، کیونکہ انہیں یقین تھا کہ ہندوستانی شان و شوکت، رعب و دبدبہ، اور دولت کے اظہار سے مرعوب ہوں گے۔ یہ دربار نچلی سطح سے لے کر اعلیٰ سطح کی حکومت کے عہدیدار منعقد کرتے تھے۔ خاص طور سے وائسرائے کے دربار کی بڑی اہمیت تھی کیونکہ اس میں والیان ریاست معہ اپنے درباریوں اور ساز و سامان کے آتے تھے اور بھرے دربار میں اپنی وفاداری کا اعلان کرتے تھے۔ یہ روایت 1860ء میں وائسرائے جان لارنس سے چلی اور کرزن کے دور میں 1903ء میں دہلی کا مشہور دربار ہوا۔ کہ جس میں ہندوستان کے تمام والیان ریاست نے اپنے روایتی تزک و احتشام کے ساتھ اس میں شرکت کی۔ اکبر الہ آبادی نے اس دربار کے بارے میں یہ دلچسپ نظم لکھی تھی۔

سبھا میں دوستو کرزن کی آمد آمد ہے
گلو میں غیرت گلشن کی آمد آمد ہے
رئیس و راجہ و نواب منتظر ہیں بہ شوق
کہ نائب شہ لندن کی آمد آمد ہے
وہ ہو کے آتے ہیں قائم مقام قصر ہند
ستاروں میں مہ روشن کی آمد آمد ہے
تمام مذہب و ملت میں ہے کشش پیدا
مغان و شیخ و برہمن کی آمد آمد ہے
گرہ میں زر نہیں اور ٹیم ٹام لازم و فرض
اس سبب سے مہاجن کی آمد آمد ہے

درباروں کے اس انعقاد نے مغل روایت کو زندہ کر دیا کہ اس کے ذریعہ وفاداروں کو خطابات و انعامات دیئے جاتے تھے۔ ان کی خدمات کا اعتراف کیا جاتا تھا' اور اس طرح انہیں معاشرہ میں باوقار اور باعزت بنایا جاتا تھا۔ چنانچہ وائسرائے کے درباروں میں حکومت سے تعاون کرنے والوں کو خطابات ملتے تھے' جاگیریں دی جاتی تھیں' اور وائسرائے ان سے ہاتھ ملا کر اور حال پوچھ کر ان کی عزت افزائی کرتا تھا۔ اس کے عوض دربار میں آنے والے حکومت کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتے تھے۔

مغلوں کی شاہانہ روایات سے سلسلہ جوڑتے ہوئے برطانوی حکومت نے اپنا دارالحکومت کلکتہ سے 1911ء میں دہلی منتقل کر دیا۔ کلکتہ تجارتی لحاظ سے ایک اہم شہر تھا' مگر اب برطانوی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ماتحت تجارتی نہیں رہی تھی' بلکہ تاج برطانیہ کے تحت سیاسی اور شاہی حکومت تھی' اس لئے دارالحکومت کو دہلی میں لانا اہمیت کا حامل تھا' کیونکہ یہ شہر نہ صرف تاریخی اہمیت رکھتا تھا بلکہ صدیوں سے ہندوستان کے حکمرانوں کا مرکز اور شاہی شان و شوکت کی علامت تھا۔ اس تبدیلی سے

وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے انہوں نے ہندوستان کے ماضی سے اپنا رشتہ جوڑ لیا ہے اور اب ان کی حیثیت مغلوں کے وارث کی ہے۔

جیسا کہ اب تک ہوتا آیا تھا کہ ہر شاہی خاندان نے دہلی کے اردگرد اپنا شہر بسایا تھا۔ اس روایت پر عمل کرتے ہوئے برطانوی حکومت نے بھی نئی دہلی کو آباد کیا کہ جس کی عمارات میں اینگلو انڈین طرز تعمیر کو اختیار کیا گیا تاکہ ان کی انفرادیت بھی برقرار رہے اور ان کا روایت سے تعلق بھی دیکھا جا سکے۔

برطانوی حکومت کو اس کا پورا پورا احساس تھا کہ وہ ہندوستان پر اس وقت تک موثر طریقہ سے حکومت نہیں کر سکتے جب تک وہ یہاں کے لوگوں کا تعاون حاصل نہیں کریں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ہندوستان کے والیان ریاست اور زمینداروں اور جاگیرداروں کی طرف توجہ دی' کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ان کا عوام میں احترام اور وقار ہے لہٰذا ان کے ذریعہ رعیت کو قابو میں رکھا جا سکتا ہے۔ 1820ء میں مدراس کے گورنر منرو نے اس طبقہ کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ :

> ہمیں ہر قیمت پر زمینداری کو برقرار رکھنا چاہئے ..... اس وجہ سے مقامی طبقہ اشرافیہ باقی رہے گا اور معاشرے میں جو طبقاتی تقسیم ہے وہ بھی رہے گی۔ اگر زمینداری ختم ہو گئی تو نچلے طبقے کی حالت خراب ہو جائے گی اور ہماری حکومت سے ان کی وفاداری کمزور ہو جائے گی۔ (4)

جب برطانوی حکومت نے سماجی اصلاحات کا عمل شروع کیا تو انہوں نے اودھ میں تعلقداری نظام کو ختم کر کے کسانوں کو مراعات دیں' کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ان اصلاحات کی وجہ سے کسان تعلقدار سے آزاد ہو کر کاشت میں زیادہ دلچسپی لے گا اور زیادہ زراعتی پیداوار ہو گی۔ مگر جب اودھ میں 1857ء میں بغاوت پھیلی تو ان کسانوں نے حکومت کا ساتھ دینے کی بجائے اپنے پرانے تعلقداروں سے وفاداری کا اظہار

کیا۔ اس لئے بغاوت کے خاتمہ کے بعد حکومت کی سوچ میں تبدیلی آئی کہ عوام کا ساتھ دینے کی بجائے زمینداروں کو مضبوط کیا جائے جو کہ اپنی مراعات اور حیثیت کے لئے حکومت کے محتاج رہیں گے' اور محدود تعداد میں ہونے کی وجہ سے ان پر قابو بھی پایا جا سکے گا۔ یہ حکومت اور رعیت کے درمیان ایجنٹ کا کام دیتے ہوئے اپنے اپنے علاقوں میں امن و امان بھی برقرار رکھیں گے اور جب بھی ضرورت پڑے گی حکومت کی مدد بھی کریں گے۔

چنانچہ حکومت نے اس طبقہ کو مضبوط و مستحکم بنانے کے لئے قوانین بنائے کہ جن کے ذریعہ ان کی جائیدادیں محفوظ رہیں۔ مثلاً جائیداد کی وراثت کا قانون کہ یہ تقسیم ہو کر ختم نہ ہو' نابالغ جاگیردار کی صورت میں کورٹ آف وارڈ کے ذریعہ جائیداد کا انتظام' پنجاب میں 1901ء میں ایلی نیشن ایکٹ (Alienation Act) کہ جس کے ذریعہ ساہوکاروں اور شہر کے تاجروں پر زمین خریدنے پر پابندی وغیرہ۔ (5) اس طبقہ کی تعلیم و تربیت کے لئے میو کالج اجمیر' ایچی سن کالج لاہور اور تعلقدار کالج لکھنؤ کا قیام۔

برطانوی حکومت کی نظروں میں زمینداروں اور جاگیرداروں کی اہمیت اس وقت اور بڑھ گئی کہ جب ہندوستان میں متوسط اور یورپی تعلیم یافتہ پیدا ہوا' جو نہ صرف سیاسی طور پر باشعور تھا' بلکہ سیاست میں اپنے حقوق کا بھی مطالبہ کرنے لگا تھا۔ لہٰذا اس طبقہ کی اہمیت کو گھٹانے کے لئے حکومت کا رویہ زمینداروں کے حق میں ہوتا چلا گیا کہ جو حکومت کے وفادار تھے۔ (6) حکومت نے ان کی وفاداری کو برقرار رکھنے کے لئے "تسلط" کی پالیسی کو اختیار کر رکھا تھا کہ جس کے ذریعہ ان کی پوری نگرانی کی جاتی تھی' اگر ان کے رویہ میں ذرا بھی مخالفانہ بات ہوتی تو اس کی سزا فوری دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ حکومت ان کی وفاداری کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی خدمات کے عوض انہیں خطابات سے نوازتی تھی' دربار میں ان کے لئے کرسی ہوتی تھی' حکومت کے عہدیدار ان سے شرف ملاقات کرتے اور ان کے تحفے تحائف قبول کرتے تھے۔ (7) لہٰذا اس نظام تسلط کے ذریعہ انہوں نے اس طبقہ کو اپنی نگرانی میں رکھا۔

ہندوستان میں امن و امان قائم رکھنے اور لوگوں میں تحفظ کا احساس پیدا کرنے کے لئے برطانوی حکومت نے ضروری سمجھا کہ ایماندار اور کام کرنے والی بیوروکریسی ہو۔ لہٰذا بیوروکریسی کے لئے مقابلہ کے امتحان پاس کر کے وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کا طبقہ آتا تھا کہ جو آکسفورڈ اور کیمبرج کا تعلیم یافتہ ہوتا تھا۔ ان کی اعلیٰ تنخواہیں اور بہت سی مراعات ہوتی تھیں کہ جن کی وجہ سے یہ ایماندار بھی رہتے تھے' اور پرسکون و آرام دہ زندگی بھی گذارتے تھے۔ بیوروکریسی کے اس عمل میں 20 سال کی عمر میں اسسٹنٹ کمشنر ہو کر وہ 300 پونڈ تنخواہ لیتا تھا' 30 سال کی عمر میں اس کی تنخواہ 2'400 پونڈ ہو جاتی تھی' اور 50 سال کی عمر میں 3'500_ ریٹائر ہو کر وہ 1000 پونڈ پنشن کا حقدار ہوتا تھا۔ بیوروکریسی میں ایک اچھے افسر کے لئے ضروری تھا کہ وہ ذہین سے زیادہ محنتی ہو۔ (8) ان عہدے داروں کو اپنے علاقوں میں وسیع اختیارات ملے ہوتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ 1860ء میں ایس۔ ایس۔ تھوربون پنجاب میں' اپنے علاقے میں بادشاہ کی طرح سے انصاف کرتا تھا۔ مالکم ڈارلنگ (1906ء) کہتا تھا کہ میرے حکم پر اس طرح سے عمل ہوتا ہے جیسے خدائی احکامات پر۔ بیوروکریسی اور رعیت کے درمیان تعلقات کو وہ "مائی باپ" کے نظریہ کا نام دیتے تھے کہ رعیت ان کے لئے ایسی ہی ہے جیسی کہ ماں باپ کے لئے اولاد۔

لیکن مائی باپ اور سرپرستی کے رویہ کے ساتھ وہ بغاوت' اطاعت سے گریز' یا مخالفت کی صورت میں سختی و تشدد کی پالیسی پر عمل کرتے تھے۔ ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ جب انہوں نے اپنے مخالفوں کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کیا۔ مثلاً 1872ء میں کوکا پنجاب میں بغاوت کے نتیجہ میں مظاہرین کو گولی ماری گئی اور 49 کو توپ سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ جب ڈویژنل کمشنر آیا تو اس نے مزید 16 لوگوں کو پھانسی دے دی۔ (9) 1919ء میں جلیانوالہ باغ کا قتل عام اس پالیسی کی ایک اور مثال ہے کہ جس کے بعد ڈائر کو سزا دینے کے بجائے بطور ہیرو تسلیم کیا گیا۔ جب بیسویں صدی میں تحریک آزادی شروع ہوئی تو اس میں مظاہرین اور سیاسی راہنماؤں پر سختی کی گئی سزاؤں میں قید و بند

سے لے کر پھانسی تک شامل رہی ہیں۔ اس تشدد کی پالیسی میں نہ صرف سول انتظامیہ شریک رہی، بلکہ ضرورت پڑنے پر فوج کو بھی استعمال کیا گیا۔ اس کی مثال سندھ میں حروں کے خلاف، اور پنجاب میں سیاسی تحریک کو کچلنے کے لئے مارشل لاء کا نفاذ ہے۔

آخر وہ کیا وجوہات تھیں کہ جن کی وجہ سے انگریزوں کو ہندوستان چھوڑ کر جانا پڑا۔ ابتدائی دور کے انگریز منتظمین جو یہ سمجھتے تھے کہ ان کا اقتدار ہمیشہ رہے گا اور ان کی امپائر کو کبھی زوال نہ ہو گا، آخر وہ کیوں اس پر مجبور ہوئے کہ اپنی امپائر کے اس ہیرے کو چھوڑ دیں؟

اس کی دو وجوہات ہیں: ایک تو یہ کہ آئینی اصلاحات کے نتیجہ میں آہستہ آہستہ اہل ہندوستان حکومت کے کاروبار اور انتظام میں شریک ہوتے رہے یہاں تک کہ 1940ء کی دہائی میں یہ صورت ہو گئی کہ برطانوی عہدے داروں اور حکومت کے لئے اپنا اقتدار قائم رکھنا محال ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ معاشرہ میں اٹھنے والی سیاسی تحریکیں اس قدر طاقت ور ہو گئیں کہ ان کو تشدد سے کچلنا بھی ناممکن ہو گیا۔ اس لئے برطانوی حکومت جو دو جنگوں کے بعد مضمحل اور خستہ ہو چکی تھی اس کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ اپنے نوآبادیاتی نظام سے دستبردار ہو جائے۔

دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ سیاسی تحریکوں، سول نافرمانی، ولایتی مال کا بائیکاٹ، سودیشی تحریک، اور ہندوستان میں ابھرتی ہوئی صنعتوں نے، ہندوستان کو معاشی طور پر برطانیہ کے لئے فائدے کی بجائے نقصان کا باعث بنا دیا اور ان کا تجزیہ یہ ہوا کہ یہ ان کے لئے اقتصادی لحاظ سے ایک بوجھ بنتا جا رہا ہے۔ لہٰذا اس کا حل اسی میں ہے کہ اسے آزادی دے کر برطانوی سرمایہ کو جو یہاں پہلے سے موجود تھا، اس کی حفاظت کی جائے۔

جب ملک آزاد ہوا تو یہ ہندوستان کی تاریخ کا اہم واقعہ تھا کہ اس مرتبہ غیر ملکی حکمراں ہندوستانی بن کر اس کے معاشرے میں ضم نہیں ہوئے، بلکہ اپنی علیحدگی کو برقرار رکھتے ہوئے یہاں سے رخصت ہو گئے۔

حوالہ جات

1. Wurgaft, P. 7

2_ سر سید: مقالات نہم، لاہور 1962ء_ ص- 106

3_ ایضاً: ص- 100

4. Bearce, P. 137

5_ تفصیل کے لئے دیکھئے: ڈاکٹر مبارک علی! جاگیرداری، لاہور 1997ء

6. Hutchins, P. 187

7_ جاگیرداری-

8. Dewey, Clive : Anglo_Indian Attitudes. Cambridge, 1993, P. 5

9_ مٹکاف: ص- 39

نو آبادیاتی ورثہ

نو آبادیاتی نظام ایک ایسی سوچ' نظریہ اور فکر کی پیداوار تھا جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ دنیا میں نسلوں اور قوموں میں فرق و اختلاف ہے جس کی وجہ سے کچھ نسلیں اعلیٰ و برتر اور مہذب ہیں اور کچھ کم تر و غیرمہذب اور پس ماندہ۔ لہٰذا اعلیٰ و مہذب نسلوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ غیر متمدن نسلوں کو اپنی ماتحتی میں رکھ کر مہذب بنائیں اور ان کی زندگی و مستقبل کو بہتر بنانے میں مدد دیں۔ مغربی تہذیب کو اس بات پر بھی ناز تھا کہ اس کی تہذیب اور کلچر میں سائنسی سوچ اور فکر ہے جس کی وجہ سے انہوں نے جو نالج سسٹم تشکیل کیا ہے وہ سب سے بہتر ہے۔ لہٰذا دنیا کی ترقی کا دارومدار اس نالج سسٹم پر ہے۔

لہٰذا جب مغربی ملکوں نے اپنی نو آبادیات پر تسلط مضبوط کیا تو انہوں نے اول تو محکوم قوموں اور نسلوں میں اس احساس کو پیدا کیا کہ وہ تہذیبی طور پر ان سے بہت پیچھے ہیں۔ اس لئے مغرب کا تسلط ان کے لئے باعث نعمت و برکت ہے۔ دوسرے انہوں نے علمی طور پر ذہنوں کو مسخر کیا جس کی وجہ سے نو آبادیات کے لوگوں کو اپنی روایات و قدروں سے نفرت ہو گئی۔ انہیں اپنا مذاہب توہمات کا مجموعہ' اپنا کلچر جہالت کا مظہر اور اپنا ادب لغویات کا مجموعہ نظر آنے لگا۔

نو آبادیاتی حکمرانوں نے نہ صرف فوج' پولیس اور مخبری کے اداروں سے حکومت کی' بلکہ لوگوں کو ذہنی طور پر محکوم بنانے کے لئے تعلیمی اداروں کے ذریعہ اپنے نالج سسٹم کو بھی نافذ کیا۔ اس قسم کے نصاب بنائے گئے کہ جس میں یورپی اقوام اور مغرب کی برتری قائم ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ ترقی کا ماڈل بن گیا۔ اور اس پر یقین ہو

گیا کہ اگر کسی ملک کی ترقی ہو سکتی ہے تو انہیں راہوں پر چل کر ہو سکتی ہے جس پر یورپ چلا تھا۔ نالج کے اس غلبہ اور تسلط نے ہر مقامی ادارے اور روایت کو پس ماندہ بنا کر ختم کر دیا۔ چاہے وہ زراعتی ترقی ہو' آریو ویدک اور یونانی حکمت ہو' یا مقامی ٹکنالوجی ہو۔ زندگی کے ہر شعبہ میں اس چیز کو تسلیم کر لیا گیا کہ مغربی صنعت و حرفت اور ٹکنالوجی اور علوم فنون مکمل' جامع اور تمام غلطیوں سے پاک و صاف ہیں۔ لہٰذا جب تک نو آبادیاتی معاشرے یورپی تہذیب اختیار نہیں کریں گے ان کی خوش حالی و ترقی ناممکن ہو گی۔

چنانچہ جب نو آبادیاتی دور کا خاتمہ ہوا تو سیاسی طور پر تو ایشیا و افریقہ کے ملک آزاد ہو گئے' مگر سماجی و معاشی' سائنسی اور فکری طور پر یہ مغرب کے زیر اثر اور تسلط میں ہی رہے۔ ان ملکوں میں جو حکمران طبقہ آیا یہ وہ لوگ تھے کہ جو مغرب کے تعلیم یافتہ تھے اور مغربی تہذیب سے متاثر تھے۔ ان کے نزدیک جدیدیت کے معنی مغربی تہذیب و تمدن اور کلچر کو اختیار کرنا تھا۔ لہٰذا آزادی کے بعد بھی نو آبادیاتی دور کے ادارے اور روایات باقی رہے۔

جس طرح نو آبادیاتی دور میں انگریز حکمراں مقامی روایات اور اداروں کو حقارت سے دیکھتے تھے آج بھی ہمارا طبقہ اعلیٰ انہیں جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ وہ اپنی سوچ اور فکر کے اعتبار سے خود کو یورپی سمجھتا ہے اور اپنے عوام کو جاہل' وحشی اور گندا۔ ثقافتی طور پر اس کا ذہن یورپ سے جڑا ہوا ہے۔ اس لئے اپنے ملک میں وہ خود کو اجنبی اور غیر سمجھتا ہے۔ اس کی زبان' لباس' رہنے کا انداز یہ سب عام لوگوں سے مختلف ہیں۔ ان کا بھی اس ملک سے اتنا ہی تعلق ہے کہ جتنا انگریزوں کا تھا عام لوگوں اور ملک کے ذرائع کا استحصال کیا جائے اور دولت کو سمیٹ کر یورپ و امریکہ میں پہنچایا جائے۔

ان کے حکومت کرنے کے طور طریق بھی وہی ہیں۔ فوج' پولیس' بیوروکریسی اور خفیہ اداروں کے ذریعہ عوام کو خوف و دہشت کی حالت میں رکھا جائے۔ دوسری طرف ذرائع ابلاغ عامہ کے ذریعہ عوام کو مستقل طور پر دباؤ میں رکھا جائے۔ ابلاغ عامہ کے

ذرائع کو استعمال کر کے حکومت عوام کے ذہنوں کو مسخر کرتی ہے۔ جو حکومت کے مخالف ہیں وہ ملک دشمن' غدار اور بیرون ممالک کے ایجنٹ ہو جاتے ہیں۔ حکومت کے ہر اقدام کو عوام کی فلاح و بہبود کا باعث بتایا جاتا ہے۔ تعلیمی اداروں میں نصاب کے ذریعہ ہر حکومت خود کو عوامی نمائندہ بتاتے ہوئے پچھلی حکومتوں پر تنقید کرتی ہے۔ نظریاتی طور پر نوجوان نسل کے ذہنوں پر قدغنیں لگا کر انہیں سوچنے' غور کرنے اور چیلنج کرنے سے روکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا معاشرہ ذہنی طور پر روز بروز پس ماندہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

نو آبادیاتی دور کا ایک اور ورثہ جو ہمیں ملا ہے وہ حکمراں طبقوں اور عوام میں دوری کا ہے۔ حکومت کے ادارے اور ان کے منتظمین کو اس بات کے مواقع ملتے ہیں کہ وہ اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کر سکیں جب کہ نچلی سطح پر عوام ان سہولتوں سے محروم رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ریاست اس کے ادارے اور منتظمین بالا سطح پر رہتے ہوئے خود کو مہذب' تعلیم یافتہ اور ترقی پسند سمجھتے ہیں' جب کہ عوام ان کی نظروں میں جاہل' غیرمہذب' گنوار اور ادب آداب سے عاری ہو جاتے ہیں۔ اس دوری اور فرق سے ان دونوں طبقوں میں نفرت اور دشمنی ہو گئی ہے۔ عوام کے نزدیک ریاست اور انتظامیہ ظالم' استحصالی اور عوام دشمن ہے۔ جب کہ طبقہ اعلیٰ کے لئے عوام دہشت گرد' ریاست کو تباہ کرنے والے اور دشمن ہیں۔ لہٰذا ریاست کی پالیسی ہے کہ ہر عوام مخالفت کو سختی سے کچلا اور دبایا جائے۔ اس نے ریاستی اداروں کو دہشت گرد بنا دیا ہے جنہیں عوام کو کچلنے' دبانے اور تہس نہس کرنے میں کوئی عار نہیں ہوتی ہے۔

جب کہ ایک مرتبہ ریاست اور اس کے ادارے کرپشن' بدعنوانی اور لاقانونیت کی علامت بن جائیں تو پھر معاشرے میں ایمانداری' اعلیٰ ظرفی' پیشہ وارانہ فرائض کی ادائیگی کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔

معاشرہ میں اس وقت تک لوگوں میں توانائی اور جان رہتی ہے کہ جب تک انہیں

امید ہو کہ تبدیلی کے ذریعہ حالات کو بدلا جا سکے گا۔ لیکن جب بار بار کی تبدیلیاں حالات کو بدلنے میں ناکام ہو جائیں' تو اس وقت معاشرہ میں بے حسی اور جمود طاری ہو جاتا ہے اور لوگوں میں حالات کو تبدیل کرنے کے جذبات سرد پڑ جاتے ہیں۔

ان حالات میں لوگوں کے لئے ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ وقت کے ساتھ سمجھوتہ کرکے اپنی بقا کے لئے جدوجہد کی جائے۔ اس بقا کی جدوجہد میں لوگ بدعنوان' خوشامد' منافقت اور بے عزتی کو اختیار کرتے ہوئے نہیں جھجکتے ہیں۔

یہی وہ صورت حال ہے کہ جس سے آج ہمارا معاشرہ دوچار ہے۔